اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اسلام آباد

ناشر

ڈاکٹر اکرام الحق، سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

ڈیزائن و پیسٹنگ

شہزاد اقبال فاروقی، شعبہ کمپیوٹر
اسلامی نظریاتی کونسل- اسلام آباد

زیر اہتمام

۴۶، اتاترک ایونیو، جی۔۵/۲، اسلام آباد
فون: ۹۲۴۵۹۹۳-۰۵۱ فیکس: ۹۲۱۷۳۸۱-۰۵۱
ای میل: contact@cii.gov.pk
ویب سائٹ: www.cii.gov.pk

پرنٹر

موسیٰ پرنٹرز، بلیو ایریا، اسلام آباد
۵۵۴۷۱۲۵-۰۳۳۳، ۲۶۰۴۸۴۰-۰۵۱

Moosa Printers

تقدیم

اجتہاد اسلامی فکر و عمل کی زندہ و جاوید روایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا کوئی گوشہ اس روایت سے خالی نہیں رہا ہے۔ فقہائے اسلام نے ہر زمانے میں نت نئے تحدیات کا سامنا کرتے ہوئے اجتہاد کی روایت کو زندہ رکھا ہے اور یہ روایت آج بھی جاری و ساری ہے۔ آج اسلامی فکر کو عالمی دنیا کے تناظر میں جدید تحدیات کا سامنا ہے جن میں مابعد جدیدیت، مابعد عالمگیریت، مسلم دنیا اور دیگر معاشروں کے باہمی تعلقات اور پرامن بقائے باہمی جیسے مسائل اہم ہیں، لہٰذا مسلم فکر و عمل کو اپنی روایت کے ساتھ رہتے ہوئے ان مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دنیا میں اپنا باعزت مقام بنانا ہے اور دنیائے علم کے چراغوں کو منور کرنا ہے۔ رسالہ اجتہاد اسی روایت کا تسلسل ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل کا مؤقر جریدہ ہے اور جس کا مقصد مختلف موضوعات پر عالم اسلام میں جاری علمی و فکری کاوشوں کو آسان اور سہل زبان میں اہل علم کے ابلاغ کے لیے پیش کرنا ہے۔ اب تک رسالہ اجتہاد نے اس علمی و فکری روایت کو نبھایا ہے اور علمی و فکری حلقوں سے داد پذیرائی حاصل کی ہے۔ رسالہ اجتہاد میں ملک کے ممتاز علماء، ماہرین اور دانشوروں کے رشحات قلم شائع کیے جاتے ہیں تاکہ علمی مکالمے کو فروغ حاصل ہو۔ رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ عصر حاضر میں ابھرنے والے دینی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کو موضوع بحث بنا کر ان کے بارے میں دینی نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل چونکہ تمام مکاتب فکر کے لیے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے رسالہ اجتہاد میں تمام نقطہ ہائے نظر کو صحت مندانہ اور تعمیری اظہار خیال کرنے کا حق حاصل ہے۔

امید ہے کہ اس کاوش کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم اس کاوش پر آپ کی تنقید، تبصرے اور تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز
مدیراعلیٰ

اداریہ

انسانی زندگی تغیر پذیر ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو تغیر و تبدل سے خالی ہو۔ نت نئی تبدیلیاں زندگی کا حسن و دوام ہیں۔ یہی روح اجتہاد ہے۔ اجتہاد دینی حوالے سے انسانی فکر و تدبر کا تسلسل ہے۔ اسی کا اعلیٰ درجہ تفقہ فی الدین ہے۔ جس سے مجتہد وحی الٰہی کی روشنی میں زمانے کے نئے مسائل و تحدیات کا حل تلاش کرتا ہے۔ بے بنیاد اور بے سمت فکر کا اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اجتہاد قرآن و سنت کی روشنی سے منور ایسا چراغ ہے، جو امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے ہر دور میں روشن رہے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا رسالہ اجتہاد اسی فکر کا داعی ہے جو اپنی فکری روایت کو قائم رکھتے ہوئے ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جس میں عالم اسلام میں جاری اجتہادی کاوشوں کی مثبت و مدلل آراء کو قارئین کے مطالعے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

اب تک رسالہ اجتہاد کے دس شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر گیار ہواں شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں علامہ اقبال اور اسلامی تعمیرنو، اسلام اور مغرب، عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد، مسانید سیرت اور جدید فقہی مسائل کے موضوعات پر اہل علم کے رشحات فکر پیش کیے جا رہے ہیں۔

اقبالؒ اور تعمیر نو کے موضوع پر " اقبال اور تعمیر نو اور ریاست پاکستان کے عملی اقدامات " کے عنوان سے زیر دستخطی کے مضمون میں علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کی روشنی میں وطن عزیز پاکستان میں اسلامی تعمیر نو کے حوالے سے قائم ہونے والے اداروں کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ " اسلام اور مغرب " کے موضوع پر ساجد شہباز خان نے اپنے مضمون "اسلام اور مغرب: توافق اور تصادم" میں استشراق، الحاد جدید اور علمیات کے حوالے سے اسلام اور مغرب کے مابین تصادم اور موافقیت کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جبکہ مفتی یاسر احمد زیرک نے اپنے مضمون میں اجتماعی اجتہاد کی تاریخ اور دور حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے حوالے سے عالم اسلام کے نمایاں اداروں کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل نے اپنے مضمون "مسانید سیرت اور استحکام پاکستان" میں ملک عزیز میں سیرت النبی ﷺ پر ہونے والی علمی تحقیقات اور استحکام پاکستان کے حوالے سے جامعات میں قائم مسانید سیرت کی خدمات و اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ جدید فقہی مسائل کے موضوع کے حوالے سے ڈاکٹر انعام اللہ نے اپنے مضمون "عدت کی مدت، جدید تحقیقات کی روشنی میں" میں عدت کی مدت کو متعین کرنے میں طبی تحقیقات اور شرعی احکام کا ایک موازنہ پیش کیا ہے۔

تاریخی دستاویزات کے ضمن میں زیر نظر شمارہ میں پاکستان میں نفاذ شریعت کے حوالے سے علامہ محمد اسد کی مرکزی حکومت کو ارسال کردہ یادداشت اگست ۱۹۴۸ء کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے جو کہ پاکستان میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کے حوالے سے اہم دستاویز ہے۔

شمارے میں سیرت چیئر، پشاور یونیورسٹی اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کے زیر اہتمام دو روزہ مشاورتی ورکشاپ بعنوان "بین المذاہب و سماجی ہم آہنگی" کی رپورٹ کو شامل کیا گیا ہے جس میں ملک میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر مسانید (chairs) کے قیام پر وفاقی وزیر احسن اقبال کی تقریر مطالعہ کے لیے اہم ہے۔

ادارے کا ان تحریروں میں بیان کردہ موقف یا آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ تاہم مجلّے کی اشاعت کے فنی تقاضوں کی بنیاد پر مقالات کی مناسب تدوین کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں اس شمارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، سرگرمیوں اور مطبوعات کی ایک جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ہم مجلّے کو مزید بہتر بنانے کے لیے آپ کی تنقید، تبصروں اور تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق

مدیر مسؤل

علامہ اقبال کا نظریہ تعمیر نو اور ریاست پاکستان کے عملی اقدامات

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق

سیکریٹری، اسلامی نظریاتی کونسل

مسلم معاشرے کی اجتماعی اصلاح کے لیے تجدید اور نشأۃ ثانیہ کی اصطلاحات معروف ہیں، اس ضمن میں مجددین کا تذکرہ زبان زد خاص وعام رہتا ہے۔ اصلاح کے اس عمل میں عموماً مسلمانوں کو اپنے دینی نظام اور ثقافت کی طرف رجوع کرنے کا کہا جاتا رہا اور اسلامی تعلیمات سے استفادے کا انداز روایتی رہا۔ جدید پیش آمدہ حالات سے ہم آہنگی اور مسائل کے حل کے لیے اجتہاد اور تقلید کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ تجدید اور نشأۃ ثانیہ کے بارے میں بہت سے اہل علم نے قلم اٹھایا۔ علامہ سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت " اس موضوع پر اردو میں ایک عمدہ کتاب ہے۔ برصغیر میں انگریزی استعمار نے اسلامی نظامِ تعلیم وثقافت اور حکومت وریاست کے بنیادی ڈھانچے پر گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں شخصیات کی بجائے اداروں پر اور نصوص کی بجائے قواعد وضوابط پر انحصار کا رواج ہوا۔ اسی طرح روایتی طرز اجتہاد کی بجائے ادارہ جاتی اجتہاد کی ضرورت محسوس کی گئی، جس کی بنیاد پارلیمانی قانون سازی پر رکھی گئی۔ گویا اجتہاد پارلیمنٹ کا تخصص قرار پایا اور ادارے مقلد محض ٹھہرے، آئین نے احکام سلطانیہ کی جگہ لے لی اور قانون فقہی مسائل کے طور پر نافذ ہوا۔ پھر ہر ادارے کے داخلی نظام کے لیے قواعد وضوابط فقہی فروع کے قائم مقام ہوئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فکر اجتماعی نے بھی نئی شکل وصورت اختیار کی۔ ایسے میں مسلم مفکرین نے تجدید واصلاح کا کام شروع کیا تو وہ بھی فطرتاً غیر روایتی تھا۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳- ۱۷۶۲ء) اور سر سید احمد خان (۱۷ اکتوبر ۱۹۱۷- ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) اس تحریک تجدید واصلاح کے پیشوا شمار ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس تجدید فکر کو ایک نیا نام دیا جسے "دینی فکر کی تعمیر نو یا تشکیل نو" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر علامہ کے چھ خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" مشہور ہیں۔ اس فکری تعمیر نو کو ادارہ جاتی شکل دینے کے لیے ایک تحریک چلی جس نے بہت تیزی سے تحریک پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔ اس مضمون میں تعمیر نو کی تشریح کا محور علامہ کے انہیں خطبات، اور خصوصاً چھٹے خطبے "The Principle of Movement in Islam " کو قرار دے کر اس کے لیے اٹھائے جانے والے عملی اقدامات اور اداروں کی تأسیس کا ذکر ہوگا جہاں اسلامی فکر کی تعمیر نو کا کام سرانجام پایا، یا اس کی تجاویز دی گئیں۔ چھٹے خطبے کے عنوان کا لفظی ترجمہ شاید "اسلام میں اصول حرکیت" کیا جا سکے۔ علامہ کے سامنے ہی اس کا اردو عنوان "الاجتہاد فی الاسلام " معروف ہو گیا۔ اسے عنوان حرکیت کا دیں یا اجتہاد کا، خطبے کے عنوان سے واضح ہے کہ یہ ہوگا اسلام کے اندر رہتے ہوئے، علامہ نے دائرۂ اسلام سے نکل کر کسی اجتہاد یا حرکیت کا درس نہیں دیا۔ اقبال کے نزدیک فکر اسلامی کا منبع ومصدر قرآن وسنت ہیں۔ ان کی روشنی میں نت نئے مسائل، عصری فلسفہ اور سائنسی رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے فکر اسلامی کی تشکیل نو کرنے کو انہوں نے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ علامہ اقبالؒ نے عصری مسائل اور نظریات، جدید فلسفہ حیات اور سائنسی رجحانات کو اچھی طرح سے بھانپ کر انہیں مدلل اور معقول جوابات بہم پہنچائے۔ مغربی تہذیب اور علوم وفلسفہ سے پیدا شدہ تشکیک اور مسائل، الحادی نظریات، تعلیم جدید کا روحانی اقدار سے خالی ہونا، امت کے نوجوانوں کا مغربی تہذیب کا دلدادہ ہونا اور اسلام کے علمی ورثہ یعنی قرآن وسنت سے منہ موڑنا، مذہب کو فرسودہ اور قصۂ پارینہ سمجھنا، مسلمانوں میں اجتہادی بصیرت کا مفقود ہونا، اسلام کے حرکی تصور سے روگردانی کرنا، اندھی تقلید اور عقلیت پرستی جیسے نازک مسائل علامہ کا موضوع بحث رہے ہیں۔ تعمیر نو کی بنیاد علامہ کی اس نظم میں خوب واضح ہے۔ یہ رموزِ بے خودی ' (۱۹۱۸ء) میں ۱۳۵ اشعار پر مشتمل علامہ اقبال کی ایک طویل نظم 'آئینِ محمد یہ قرآن است ' کے چند منتخب اشعار ہیں:

ملّتی را رفت چوں آئین ز دست — مثل خاک اجزای اُو از هم شکست
هستیِ مسلم ز آئین است و بس — باطن دینِ نبیؐ این است و بس
آن کتاب زنده قرآنِ حکیم — حکمت اُو لا یزال است و قدیم
نوعِ انسان را پیام آخرین — حامل او رحمۃ للعالمین
نسخهٔ اسرارِ تکوینِ حیات — بی ثبات از قوتش گیرد ثبات
گر تو می خواهی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز به قرآن زیستن[1]

"جس قوم نے آئین ہاتھ سے جانے دیا، اس کے اجزا خاک کی طرح ریزہ ریزہ ہو گئے۔ مسلمانوں کے وجود کا دار و مدار صرف اور صرف آئین پر ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کے دین کی باطنی حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ آئین وہ زندہ و تابندہ کتاب ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ اس کی حکمت ازلی اور ابدی ہے۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے آخری پیغام ہے۔ اس کے علم بردار حضور رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں۔ یہ تکوین حیات کے رازوں کا نسخہ ہے۔ جسے قرار نہ ہو وہ اس کی قوت سے قرار پا جاتا ہے۔ اگر تم بھی مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہو تو سن لو! قرآن کے علاوہ اس کا کوئی وسیلہ نہیں۔"

علامہ اقبالؒ تعمیر نو کے تصور کو سید سلیمان ندویؒ کے نام اپنے خط میں اس طرح واضح کرتے ہیں:

It is my firm conviction that he who critically reviews modern jurisprudence from the Qur'anic viewpoint, reconstructs it, and establishes the truth and eternality of Qur'anic laws, would be the real leader and pioneer of Islamic renaissance and the greatest benefactor of humanity at large. This is the time for action; for in my humble opinion, Islam today is on trial and never in the long range of Islamic history was it faced with such a challenge as the one that besets it today[2].

"میرا پختہ یقین ہے کہ جو شخص قرآنی نقطۂ نگاہ سے جدید "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر اس کی تشکیلِ نو کر دے اور اَحکام قرآنیہ کی حقانیت اور ابدیت کو ثابت کر دے، وہی اسلامی نشاۃ ثانیہ کا حقیقی رہبر اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہو گا۔ یہی وقتِ عمل ہے؛ کیونکہ میری عاجزانہ رائے میں اسلام پر یہ آزمائش کا وقت ہے اور اپنی طویل تاریخ میں اسے کبھی ایسے حالات سے پالا نہیں پڑا جن سے وہ اس وقت دوچار ہے"۔

1- مثنوی رموزِ بے خودی یعنی اسرارِ حیاتِ ملیہ اِسلامیہ، از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ایم اے بیرسٹر ایٹ لاء، لالہ دیوان چند پرنٹر، لاہور، ص ۵۸، ۵۹

2- Iqbal Namah, Shaikh Ataullah, Ashraf Publications, Lahore, Vol. I., p. 50

اسی مضمون کاایک خط انہوں نے صوفی غلام مصطفی تبسم کے نام خط ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو لکھا، اس میں علامہ لکھتے ہیں:

> میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدّد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ میں غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے)، مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کی نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔[3]

انسانی معاشرے کی روحانی تشکیل اور آئینِ قرآن سے وابستگی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبالؒ نے اِسلامی نظامِ ریاست کی ایسی ترتیبِ نو کی بھی بات کی جس سے دورِ جدید کے مسائل کے ساتھ اس کا ربط پیدا ہو جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء بمقام الٰہ آباد میں اقبالؒ نے کہا:

> In the world of Islam we have a universal polity whose fundamentals are believed to have been revealed but whose structure, owing to our legists' [legal theorists'] want of contact with the modern world, today stands in need of renewed power by fresh adjustments[4].

"دنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالم گیر نظامِ ریاست موجود ہے جس کے بنیادی اصولوں کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی الٰہی پر مبنی ہیں، مگر اس کے تشکیلی ڈھانچہ کے جدید دنیا سے ہم آہنگ ہونے سے متعلق ہمارے فقہائے کرام کی خواہش اسی صورت پوری ہو سکتی ہے جب اس میں تازہ تطبیقات کے ذریعے نئی قوت پیدا کر دی جائے"۔

اِسلامی نظامِ ریاست و سیاست کی تشکیل نَو کے لیے مناسب ترین خطہ ہندوستان کو قرار دیتے ہوئے خطبۂ الٰہ آباد میں ہی انہوں نے کہا:

> It cannot be denied that Islam, regarded as an ethical ideal plus a certain kind of polity – by which expression I mean a social structure regulated by a legal system and animated by a specific ethical ideal – has been the chief formative factor in the life-history of the Muslims of India.It has furnished those basic emotions and loyalties which gradually unify scattered individuals and groups, and finally transform them into a well-defined

3- سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال، ۲: ۶۰۱، ۶۰۴، مکتوب اقبال بنام پروفیسر صوفی غلام مصطفی تبسم، ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء

4- All India Muslim League, Allahabad session, December-1930, Presidential Address, By Dr. Sir Muhammad Iqbal, Barrister- At- Law,Lahore,printed by Guran Ditta Kapur,Lahore,p.4

people, possessing a moral consciousness of their own. Indeed it is not exaggeration to say that India is perhaps the only country in the world where Islam, as a people-building force, has worked at its best In India, as elsewhere, the structure of Islam as a society is almost entirely due to the working of Islam as a culture inspired by a specific ethical ideal. What I mean to say is that Muslim society, with its remarkable homogeneity and inner unity, has grown to be what it is, under the pressure of the laws and institutions associated with the culture of Islam.[5]

"اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام کو اخلاقی اقدار کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص نوعیت کے سیاسی نظام کی حیثیت حاصل ہے۔ اس تعبیر سے میری مراد ایک ایسا معاشرتی ڈھانچہ ہے جس میں ایک قانونی نظام کے ذریعے نظم وضبط پیدا کر دیا گیا ہے اور ایک خاص قسم کی اخلاقی اقدار کے ذریعے اس میں روح پھونک دی گئی ہے، یہی معاشرتی ڈھانچہ ہندوستانی مسلمانوں کی بود و باش کا بنیادی تشکیلی عنصر رہا ہے۔ اس نے وہ بنیادی احساسات اور وفاداریاں مہیا کیں جو بکھرے ہوئے افراد اور گروہوں کو دھیرے دھیرے یکجا اور بالآخر ان پر مشتمل ایک واضح طور پر متعین قوم کی تشکیل کر سکتے ہیں، جن کا اپنا ایک اخلاقی شعور ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اسلام ایک بہترین مردم ساز قوت کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا ہے۔ دنیا کے دیگر خطوں کی طرح ہندوستان میں بھی ایک معاشرے کی شکل میں اسلامی نظامِ حیات کا وجود اسلام کی بطورِ تہذیب فعالیت کا مرہونِ منت ہے۔ جس کا روحِ رواں اخلاقی اقدار کا ایک خاص اسوہ ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو اپنی غیر معمولی ہم آہنگی اور داخلی ربطِ باہمی کے ساتھ ترقی کرتے کرتے جو درجہ حاصل ہوا ہے اس کی تشکیل میں ان قوانین اور اداروں کا قوی عمل دخل ہے جو اسلامی تہذیب سے منسلک ہیں"۔

اقبالؒ کے نزدیک اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کے لیے اداروں کا قیام از بس ضروری ہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے لیے اپنے صدارتی خطبہ میں مسلمانوں کے لیے نظریاتی ادارے قائم کرنے کے بارے میں فرمایا:

Fourthly, I suggest the establishment of male and female cultural institutes in all the big towns of India. These institutes as such should have nothing to do with politics. Their chief function should be to mobilize the dormant energy of the younger generation by giving them a clear grasp of what Islam has already achieved and what it has still to achieve in the religious and cultural history of mankind[6].

"چوتھے نمبر پر، میری تجویز ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں مرد وخواتین کے لیے ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان اداروں کا سیاست کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ ہو۔ ان کا اہم فریضہ نوجوان نسل کو انسانیت کی مذہبی اور ثقافتی تاریخ کے حوالے سے ان تمام پہلوؤں کا واضح شعور بخش کر ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے جن کا احاطہ اب تک اسلام کر چکا ہے اور جن کا احاطہ ابھی اسے کرنا ہے۔"

5- ایضاً

6- Presidential address All-India Muslim Conference, Lahore, 21 March 1932

علامہ کے خطبات اور تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ریاست پاکستان کا حصول اسی لیے ضروری تھا کہ اس میں خود مختاری اور آزادی کے ساتھ اسلامی معاشرے کی تعمیر نو کا کام سرانجام دیا جاسکے۔ گویا علامہؒ اس ریاست کو تعمیر نو کے ایک ادارہ کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے جس میں یورپی طرز کی پارلیمان ہو مگر وہ اسلامی طرز کا اجتہاد کر کے اجماع کے اصول کے تحت قانون سازی کرے۔ ۱۹۲۹-۱۹۳۰ء میں (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) کے عنوان سے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر انہوں نے جو چھ خطبات دیے۔ ان میں چھٹے خطبے (نظامِ اسلام میں حرکیت کا اصول) میں فرماتے ہیں:

> It is, however, extremely satisfactory to note that the Pressure of the new world forces and the political experience of European nations are impressing on the mind of modern Islam the value and possibilities of the idea of ijma'. The growth of republican spirit and the gradual formation of legislative assemblies in Muslim lands constitute a great step in advance.[7]

"تاہم اس بات کا مشاہدہ انتہائی اطمینان کا باعث ہے کہ جدید عالمی قوتوں کے دباؤ اور یورپی اقوام کے سیاسی تجربات جدید اِسلام کے ذہن پر نظریۂ اجماع کی قدر و قیمت اور امکانات کو واضح کرنے میں مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ جمہوری روح کی نشو و نما اور مسلم علاقوں میں قانون ساز اسمبلیوں کی مرحلہ وار تشکیل اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت کا درجہ رکھتی ہے"۔

علامہؒ کے خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلم معاشرے کے لیے قرآن و سنت اور شرعی تشریحات پر مبنی قانون سازی خود مسلم نمائندگان اور ماہرین شریعت سے کرانا چاہتے تھے۔ فقہی اجتہادات کو ملکی قانون بنانے کی بجائے انہوں نے ان سب سے استفادہ کر کے مشترکہ قانون سازی کا تصور پیش کیا اور اس کے لیے پارلیمان کو اجتماعی اجتہاد کا ادارہ قرار دیا۔ علامہؒ کہتے ہیں:

> The transfer of the power of Ijtihād from individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which, in view of the growth of opposing sects, is the only possible form Ijmā, can take in modern times, will secure contributions to legal discussion from laymen who happen to possess a keen insight into affairs.In this way alone, we can stir into activity the dormant spirit of life in our legal system, and give it an evolutionary out look.[8]

"مختلف مکاتب فکر کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا اختیار لے کر ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل کرنا ہی مختلف الخیال فرقوں کے ظہور کے بعد دورِ جدید میں اجماع کی ممکنہ صورت ہو سکتی ہے۔ اس سے قانونی مباحث میں شامل شرکاء کی آراء کو عام لوگوں کے عمل دخل سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے، جو کبھی کبھار اتفاقاً معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ صرف یہی واحد طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کی خوابیدہ روح کو بیدار کر کے اسے زندگی بخش سکتے ہیں۔ اسی طرح اسے ایک ارتقائی صورت عطا کی جاسکتی ہے"۔

7- The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Oxford University press London 1934, p.165

8- The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Oxford University press London 1934, p.165

پارلیمان میں علماء کابنیادی کردار

اقبالؒ پارلیمان کواجتماعی اجتہاد کاادارہ قرار دے کرایک مسلم ملک کا قانون سازادارہ بناناچاہتے تھے جس میں تمام مکاتبِ فکر کے نمائندے شامل ہوں۔ مگرچونکہ دورِحاضر میں پارلیمان میں اِسلامی قانون کاعلم رکھنے والے تمام ارکانِ اسمبلی کانہ ہوناایک ناگزیر حقیقت ہے جس کی وجہ سے قانون سازی کے باب میں شریعت اسلامی کے حوالے سے سنجیدہ غلطیوں کاامکان بہرحال موجودرہتاہے۔اس کے لیےاقبالؒ پارلیمان میں علمائے کرام کابنیادی کردار چاہتے ہیں۔اورجب تک اسمبلی کے اندر قانون سازی کے عمل میں علماء کا بنیادی کردار یقینی نہیں بنایا جاتا، علامہؒ نے عارضی انتظام کے طورپر علماء کابورڈ قائم کرنے کی گنجائش رکھی۔ لیکن اصولی طورپرانہوں نے پارلیمان میں قانون سازی کے عمل میں علماء کے بنیادی کردار کوہی ترجیح دی۔اقبالؒ کہتے ہیں:

> One more question may be asked as to the legislative activity of a modern Muslim assembly which must consist, at least for the present, mostly of men possessing no knowledge of the subtleties of Muhammadan Law. Such an assembly may make grave mistakes in their interpretation of law. How can we exclude or at least reduce the possibilities of erroneous interpretation?

"دورِجدید کی مسلم اسمبلی میں قانون سازی کے حوالے سے، جس کی ترکیب کم ازکم موجودہ حالات میں ایسے ہی اشخاص سے ہوسکتی ہے جنہیں زیادہ تر قانونِ اسلام کی باریکیوں کاعلم نہیں ہوگا،ایک اور سوال پیداہوتاہے، کہ ایسی اسمبلی قانون کی تعبیر وتشریح کرتے وقت بڑی سخت غلطیوں کی مرتکب ہوسکتی ہے۔ہم کس طرح ایسی تشریحی غلطیوں کے امکانات کی مکمل پیش بندی، یاکم ازکم انہیں کم کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں؟"

ایرانی دستورکاحوالہ دیتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں:

> The Persian constitution of 1906 provided a separate ecclesiastical committee of Ulema– “conversant with the affairs of the world”– having power to supervise the legislative activity of the Mejliss. This, in my opinion, dangerous arrangement is probably necessary in view of the Persian constitutional theory. According to that theory, I believe, the king is a mere custodian of the realm which really belongs to the Absent Imām.The Ulema, as representatives of the Imām, consider themselves entitled to supervise the whole life of the community, though I fail to understand how, in the absence of an apostolic succession, they establish their claim to represent the Imām.But whatever may be the Persian constitutional theory, the arrangement is not free from danger, and may be tried, if at all, only as a temporary measure in Sunnī countries.The Ulema should form a vital part of a Muslim legislative assembly helping and guiding free discussion on questions relating to law. The only effective remedy for the possibilities of erroneous interpretations is to reform the present system of legal education in Muhammadan countries, to extend its sphere, and to combine it with an intelligent study of modern jurisprudence.[9]

9- The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Oxford University press London 1934, p.166-67

"۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں دنیاوی امور سے واقف علمائے مذہب کی ایک علیحدہ کمیٹی بنائی گئی ہے جس کے پاس مجلس کے قانون سازی کے عمل کی نگرانی کا اختیار ہے۔ میری رائے میں یہ خطرناک انتظام شاید ایرانی نظریۂ قانون کی رو سے ضروری سمجھ کر کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نظریۂ قانون کی رو سے بادشاہ ملک و سلطنت کا محض امین ہے جو در حقیقت امام غائب کی ملک ہے۔ علماء، امام غائب کے نمائندے کی حیثیت سے معاشرتی زندگی کے تمام معاملات کی نگرانی اور دیکھ بھال اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ امام غائب کے سلسلۂ جانشینی کی غیر موجودگی میں وہ کس طرح نیابتِ امام کا حق ثابت کر سکتے ہیں، بہر حال ایران کا دستوری نظریہ چاہے کچھ بھی ہو، یہ انتظام خطرے سے خالی نہیں۔

اگر سُنّی ممالک میں اس تجربے کو دہرایا بھی جائے تو وہ محض عارضی اور وقتی ہونا چاہیے۔ علماء کو خود مجلسِ قانون ساز کا نہایت اہم اور مرکزی عنصر ہونا چاہیے تاکہ قانون سے متعلق مسائل پر آزادانہ مباحث میں معاونت و راہنمائی کر سکیں۔ غلط تشریحات کو روکنے کا مؤثر علاج صرف یہی ہے کہ اِسلامی ممالک میں رائج الوقت قانونی تعلیم کے نظام کی اصلاح کی جائے، اس کا دائرہ وسیع کیا جائے، اور اس کے ساتھ جدید اصولِ قانون کا گہرا مطالعہ بھی شامل کر دیا جائے"۔
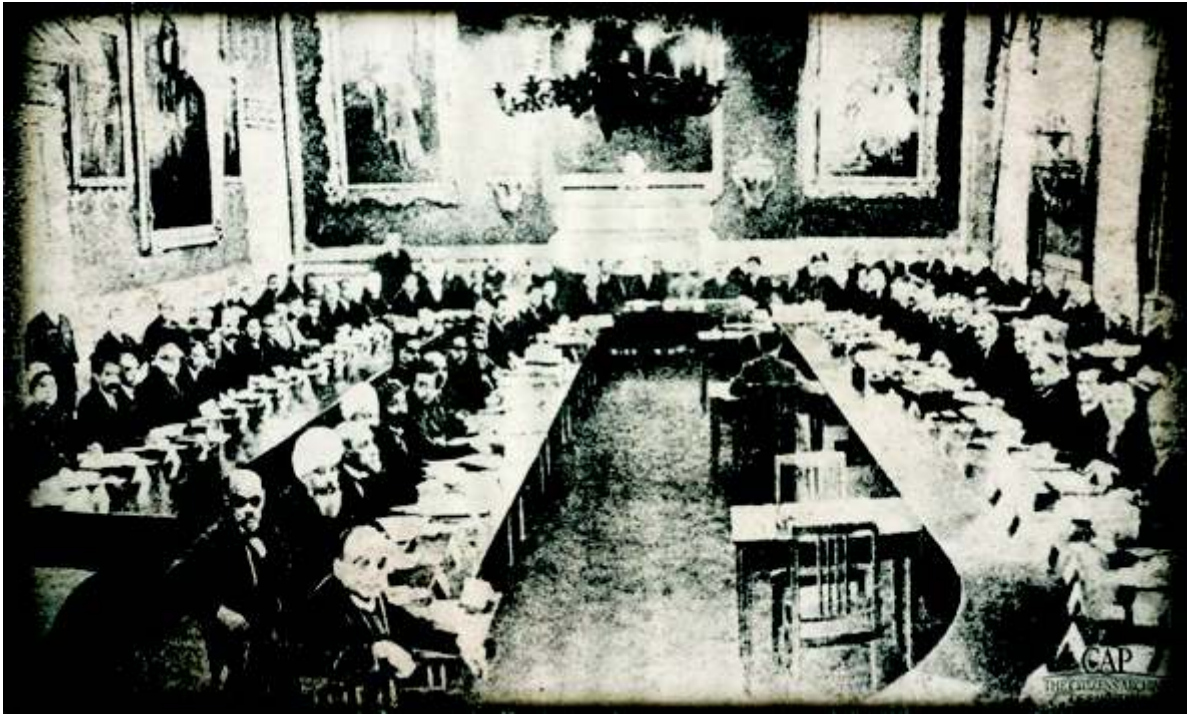
مسلم وکلاء پر مشتمل علماء کی آئینی مجلس کی تجویز

اپنے خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں علیحدہ اسلامی ملک قائم کرنے کے مطالبے کے بعد اقبالؒ نے اسلامی قانون کی تدوین و تشکیل کے لیے مستقل ادارے قائم کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے مسلمانوں کے آئندہ پروگرام کے بارے میں تجاویز دیتے ہوئے ایک تجویز یوں دی:

Fifthly, I suggest the formation of an assembly of ulama, which must include Muslim lawyers who have received education in modern jurisprudence. The idea is to protect, expand and, if necessary, to reinterpret the law of Islam in the light of modern conditions, while keeping close to the spirit embodied in its fundamental principles. This body must receive constitutional recognition so that no bill affecting the personal law of Muslims may be put on the legislative anvil before it has passed through the crucible of this assembly. Apart from the purely practical value of this proposal for the Muslims of India, we must remember that the modern world, both Muslim and non-Muslim, has yet to discover the infinite value of the legal literature of Islam and its significance for a capitalistic world whose ethical standards have long abdicated from the control of man's economic conduct. The formation of the kind of assembly I propose will, I am sure, bring a deeper understanding of the usual principles of Islam at least in this country.[10]

"پانچویں، میں تجویز کرتا ہوں کہ علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے جس میں وہ مسلم وکلاء شامل ہوں جنھوں نے جدید اصولِ قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کی حفاظت، اس کی توسیع اور اگر ضروری ہو تو نئی تاؤیل کا اہتمام کیا جائے۔ یہ کام اِسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کے نزدیک رہتے ہوئے کیا جائے۔ اس مجلس کو آئینی اعتبار سے تسلیم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے شخصی قوانین پر اثرانداز ہونے والا کوئی مسودۂ قانون، قانون سازی کے مراحل سے اس وقت تک نہ گزر سکے جب تک کہ اسے مجلس کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے اس تجویز کی خالصتاً عملی قدروقیمت سے قطع نظر، ہمیں یہ یادرکھنا چاہیے کہ جدید دنیا، مسلم اور غیر مسلم دونوں، ابھی تک اسلام کے فقہی لٹریچر کی بے پناہ قدروقیمت کا اندازہ نہیں لگا پائی، اور سرمایہ دارانہ دنیا کے لیے اس کی اہمیت کا بھی، جس کے اخلاقی معیارات آدمی کے اقتصادی رویے کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ اس نوع کی مجلس سے جیسا کہ میں نے تجویز کیا ہے، مجھے یقین ہے کم سے کم اس ملک میں اِسلام کے معمول کے اصولوں کی گہری سوجھ بوجھ پیدا ہو گی۔"[11]
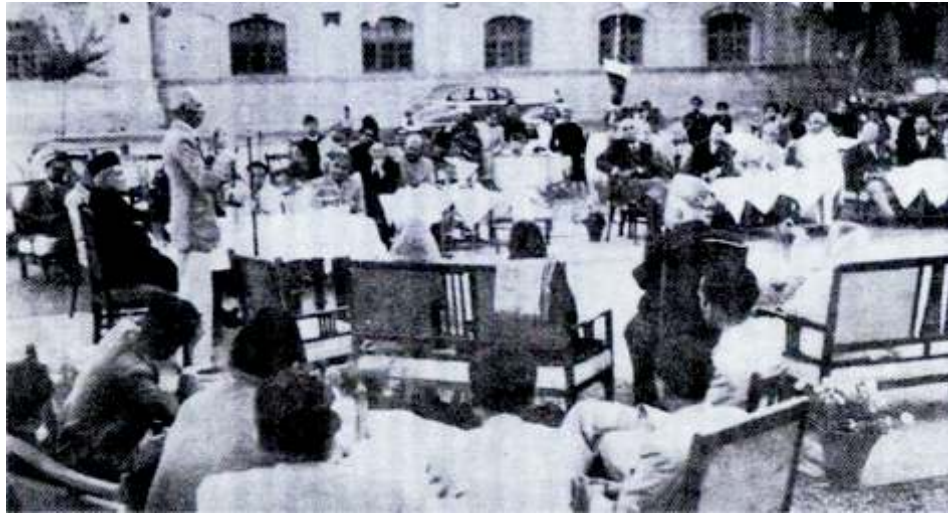
قائداعظم محمد علی جناح سندھ چیف کورٹ کے جج اور وکلاء سے خطاب کے دوران
۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء

10- http://www.koranselskab.dk/profiler/iqbal/address2.html

11- علامہ اقبالؒ: تقریریں، تحریریں اور بیانات؛ مترجم اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۵ء، آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت، لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء، ص ۶۵

تعمیر نو کے اداروں کے قیام میں علامہ کا عملی حصہ

چوہدری نیاز علی خان

علامہ اقبالؒ نے ذاتی طور پر بھی ایسے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی جو ان کے تصور میں قائم نئی اسلامی ریاست کی آئینی، قانونی، تعلیمی اور معاشرتی ضروریات پوری کر سکیں۔ ایسا ہی ایک ادارہ دارالاسلام ٹرسٹ ہے جو ان کی ترغیب پر چوہدری نیاز علی خان[12] نے ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی پنجاب میں پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور سے پانچ کلو میٹر مغرب میں جمال پور فروٹ باغات کے مقام پر قائم کیا۔ اقبالؒ کی خواہش تھی کہ اس ادارے سے فقہِ اسلامی کی تدوین نو کا کام لیا جائے۔[13] اس سلسلے میں جولائی ۱۹۳۶ء میں اس وقت کے شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا جس میں ایک روشن خیال، ماہرِ علومِ شریعہ محقق کو اس ادارے کے لیے بھیجنے کی درخواست کی۔[14] شیخ مراغیؒ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ان کے پاس ان صفات کا حامل کوئی عالم محقق میسر نہیں۔ تاہم علامہؒ کی کوشش سے اس زمانے کے بڑے بڑے محققین نے اس مرکز کی علمی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔[15] ۱۹۴۰ء سے دارالاسلام سے اسی نام کے ساتھ ایک علمی ماہ نامہ بھی شائع ہوتا تھا۔ پاکستان بنا تو چوہدری نیاز علی اپنی تمام جائداد چھوڑ کر پاکستان آگئے اور جوہر آباد ضلع خوشاب میں ٹھکانہ کیا اور یہاں بھی دارالاسلام ٹرسٹ قائم کیا۔[16]
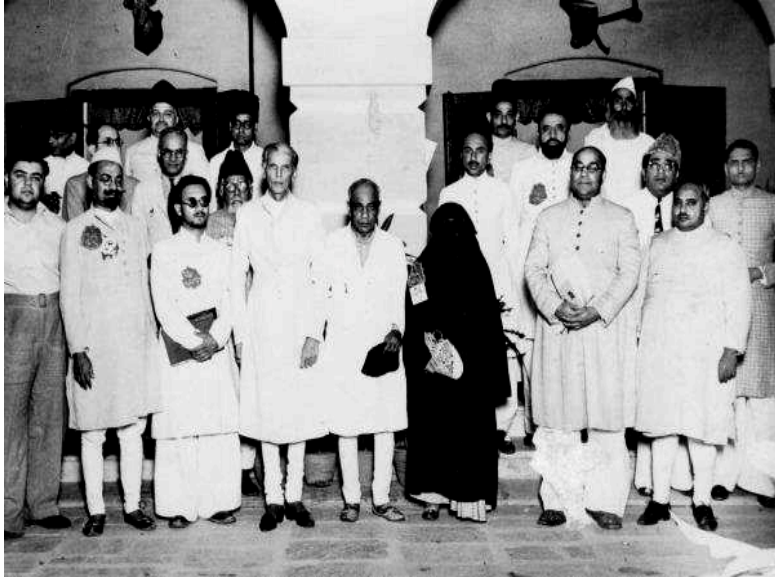
قائداعظم تحریک پاکستان کے کارکنان کے ہمراہ

یہ سلسلہ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی جاری رہا اور مجوزہ ریاست پاکستان میں اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کے مقصد سے کئی ادارے قائم کیے گئے یا تجویز کیے گئے۔ ان اداروں میں مجلسِ نظامِ اِسلامی کا قیام بھی تھا جو یو۔ پی۔ مسلم لیگ نے غالباً ۱۹۳۹ء کے اواخر میں نواب محمد اسماعیل خان (۱۸۸۶ - ۱۹۵۸ء) کی صدارت میں قائم کیا جس کا مقصد ایک مستند و مفصل "نظام نامہ حکومتِ اسلامی" مرتب کرانا تھا۔ اس میں نواب سر احمد سعید خان چھتاری، سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ شامل تھے۔ سید سلیمان ندوی کو اس کمیٹی کا داعی (کنوینر) مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی کی کوشش سے چار حضرات، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا آزاد سبحانی نے دستوری خاکے مرتب کر کے ارسال کیے۔[17]

12- چوہدری نیاز علی خان (۱۸۸۰-۱۹۷۶ء) سول انجینئر تھے اور وسیع اراضی کے مالک تھے۔ ۱۹۳۱ء میں انہیں حکومت برطانوی ہند نے "خان صاحب" کا لقب اور میڈل دیا۔ وہ علامہؒ کے بہت معتقد تھے اور ان کے کہنے پر انہوں نے تحریکِ دارالاسلام، دارالاسلام ٹرسٹ، ادارہ ہائے دارالاسلام ٹرسٹ کے نام سے پٹھانکوٹ، ہندوستان اور جوہر آباد پاکستان میں کئی ادارے قائم کیے۔ وہ مسلم لیگ کے رکن اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ ان کے ادارے جدید افکارِ اسلامی کے مراکز شمار ہوتے تھے۔ علامہ اقبال دارالاسلام پٹھانکوٹ کی براہ راست سرپرستی کرتے تھے۔

13- کے ایم اعظم: حیاتِ سدید، لاہور، ۲۰۱۰ء، نشریات، ص ۱۶۸، ۱۷۳، ۱۷۴، ڈاکٹر محمد ارشد: اِسلامی ریاست کی تشکیل جدید؛ محمد اسد: سوانح اور فکری تشکیل، الفیصل ناشرانِ کتب، لاہور، ص ۱۵۰

14- اقبال نامہ: مجموعہ مکاتیبِ اقبال، شیخ عطاءاللہ، شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مذہب سے دلچسپی اور فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید، ص ۴۷

15- کے ایم اعظم: حیاتِ سدید، ص، ۳۱، ۱۵۹، ۱۶۳

16- کے ایم اعظم: حیاتِ سدید، ص ۵۸۳

17- دریا آبادی: سید سلیمان ندوی کے خطوط، ۸۷:۲؛ سید سلیمان ندوی "شذرات" معارف (اعظم گڑھ)، مئی ۱۹۴۱ء

جن کی مدد سے مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے ۱۹۴۵ء میں ایک مسودہ تیار کر لیا جس کی اشاعت بوجوہ تاخیر سے ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے "اسلام کا سیاسی نظام" کے نام سے ممکن ہوئی۔[18]

اسی طرح آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں اجلاس منعقدہ ۲۴- ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۳ء، بمقام دہلی میں قرارداد منظور کی گئی کہ چند مستند ماہرینِ اسلام کی ایک مجلس "مجلس تعمیر ملی" قائم کی جائے، جو قرآن شریف کو سامنے رکھ کر قومی زندگی کے مسائل پر نظر ڈالے اور ایک اسلامی ریاست کا خاکہ بنائے۔ تاہم یہ مجلس قائم نہ ہو سکی۔[19] مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی (دسمبر ۱۹۴۳ء) میں ایک پلاننگ کمیٹی کے قیام کی تجویز پر اتفاق کیا گیا۔ جس کے ذمے مستقبل کی مسلم ریاست 'پاکستان' کے لیے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور دستوری و سیاسی نظام مرتب و مدون کرنے کا کام لگایا گیا۔ تاہم اس کمیٹی کی ترکیب و تشکیل اور اس کی کارگزاری کبھی سامنے نہ آسکی۔[20] آل انڈیا مسلم لیگ کی کمیٹی آف رائٹرز (مسلم لیگ کے رکن اور حامی دانشوروں کی کمیٹی) نے بھی ۱۹۴۶ء میں مجوزہ مسلم مملکت پاکستان کو مستقبل میں درپیش مسائل کے جائزہ، اس کے سیاسی نظام اور اس کی صنعتی و اقتصادی اور تعلیمی ترقی کا لائحہ عمل مرتب کرنے کی کوشش و سعی کی تھی، اور مختلف امور و مسائل پر (۱۲ عدد) کتابچے شائع کیے تھے۔[21] کمیٹی کے ایک ممتاز رکن ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنے کتابچے "The Future Development of Islam Polity" میں پاکستان کی ریاست و حکومت کی تعمیر و تشکیل میں اسلام کے کردار و حیثیت کو واضح کیا تھا۔[22]

علامہ محمد اسدؒ کی فکری تشکیل

علامہ محمد اسدؒ

مشہور نو مسلم محقق علامہ محمد اسدؒ[23] ۱۹۳۲ء میں ہندوستان آئے تو ۱۹۳۴ء میں ان کی ملاقات علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) سے ہوئی۔ اقبالؒ نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان میں رہ کر مستقبل کی اِسلامی ریاست کے فکری پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ چنانچہ محمد اسدؒ نے اپنی بقیہ زندگی میں ایسی ریاست کے قیام کو اپنا مقصد بنالیا۔

-18 دریاآبادی: سید سلیمان ندوی کے خطوط ۱۸۹:۲، پروفیسر خورشید احمد: ادبیات مودودی (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) ص ۳۸۵- ۳۸۷

-19 سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل (لاہور: مکتبۂ محمودیہ، ۲۰۰۱ء)، ص ۳۶۶- ۳۶۷

-20 سید حسین ریاض، پاکستان ناگزیر تھا (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء)، ص ۳۲۹

-21 قومی ادارہ برائے تحقیقی تاریخ و ثقافت، اسلام آباد نے ان کتابچوں کو یکجا کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (M.Rafique Afzal. The Case for Pakistan (Islamabad NHCR,1988)۔ کمیٹی آف رائٹرز کی تشکیل اور اس کے ارکان کی سرگرمیوں کے بارے میں ملاحظہ ہو: خواجہ رضی حیدر، "مولانا عبدالحامد بدایونی اور تحریک پاکستان"، مشمولہ ظہور الدین امرتسری (مرتب)، تحریک پاکستان میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے کردار کی ایک جھلک (لاہور: ادارۂ پاکستان شناسی، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۹

-22 The Future Development of Islam Polity, Pakistan Literature series No.8 (Lahore Sh.M. Asharaf,1946) ,pp.25

-23 علامہ محمد اسد (۱۹۰۰-۱۹۹۲ء) کا قدیم نام لیوپولڈ وائس (Leopold Weiss) تھا۔ وہ آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ صحافت کا پیشہ اپنایا اور ایک جرمن اخبار کے نمائندے کے طور پر مصر، اردن، شام، ترکی، فلسطین، عراق، ایران، وسط ایشیا، افغانستان اور روس کی سیاحت کرتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں نے برلن میں اسلام قبول کیا اور تقریباً چھ سال جزیرہ نمائے عرب میں رہے۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان آگئے۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۷ء میں انہیں ادارۂ اِسلامی تشکیل نو کے قیام کا ہدف دیا گیا اور وہ اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں انہیں سفارتی مشن پر عرب ممالک بھیج دیا گیا اور ان کی کوششوں سے سعودی عرب میں پاکستان کا سفارت خانہ کھولنے میں کامیابی ہوئی۔ [ہوم کمنگ آف دی ہرٹ، ص ۱۲۸- ۱۲۹] کچھ عرصے بعد محمد اسدؒ نے بوجوہ پاکستانی حکومت کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۹۹۲ء میں وہ جنوبی ہسپانیہ (اندلس) کے شہر مالقہ میں تھے کہ ان کی وفات ہو گئی۔ وہ غرناطہ میں مسلمانوں کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی کتب:

The Unromantic Orient (1924) *Islam at the Crossroads* (1934) *The Road to Mecca* (1954)، *The Principles of State and Government in Islam* (1961) *Message of The Qur'an* (1980) *Sahih Al-Bukhari: The Early Years of Islam* (1981) *This Law of Ours and Other Essays* (1987) *Home-Coming Of The Heart (1933–1992)* (Officially Unpublished)، *Meditations* (*Arafat: A Monthly Critique of Muslim Thought* (1946-47)

محمد اکرام چغتائی نے محمد اسد پر تین کتابیں لکھی ہیں جو چھپ گئی ہیں۔ محمد اسد نے بہت مقبولیت حاصل کی اور بعض کتابوں کے کئی کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔
"ایک یورپین بدوی" اور "بندہء صحرائی" اردو میں ہیں۔ انگریزی میں دو جلدوں میں ہے۔ ان کتابوں میں محمد اسد کے اپنے مضامین کے علاوہ ابوالحسن ندوی، سید سلیمان ندوی، محمد اسحاق بھٹی، انگریزی زبان کے معروف صحافی خالد احمد، مریم جمیلہ اور دیگر مشاہیر نے جو کچھ محمد اسد کے بارے میں لکھا، وہ بھی موجود ہے۔
ڈاکٹر محمد ارشد نے پنجاب یونیورسٹی سے محمد اسد پر پی ایچ ڈی کی اور ان کا مقالہ فیصل پبلشرز لاہور نے کتابی شکل میں شائع کیا۔

اسی پر ان کا مطالعہ ہوتا، اسی کے بارے میں لکھتے اور اسی پر گفتگو اور خطاب کرتے تھے۔[24] اقبالؒ کی وفات کے بعد ان میں سے اکثر محققین نے اپنی اپنی الگ الگ پہچان قائم کر لی مگر اسدؒ نے انفرادی حیثیت میں فکر اسلامی کی تشکیلِ نو پر کام جاری رکھا۔ علامہ اسد کہتے ہیں:

میں نے کئی برس تک اپنے آپ کو اس نظریے کے لیے وقف کر دیا؛ اسی کو پڑھتا، اسی کو لکھتا اور اسی پر تقریریں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آ گیا کہ میری پہچان ہی اسلامی قانون اور ثقافت کے ترجمان کے طور پر ہونے لگی۔[25]

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد علامہ محمد اسدؒ نے پنجاب کے شہر ڈلہوزی سے "عرفات" کے عنوان سے ایک ماہانہ مجلّے کا اجراء کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۴۶ء میں جاری ہوا، جس کا سرورق یوں تھا: ARAFAT; A Monthly Critique of Muslim Thought (عرفات؛ مسلم فکر کا ایک تنقیدی ماہنامہ)۔[26]

قائدِ اعظمؒ کے نام علامہ اقبالؒ کا خط

علامہ اقبالؒ نے سیاسی سطح پر بھی مسلم تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے کردار ادا کیا، وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو بھی اس سلسلے میں فعال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال قبل ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظمؒ کو یہ خط لکھا:

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟ مسلم لیگ کے مستقبل کا تمام تر دار ومدار اسی پر ہے کہ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے کیا اقدامات کرتی ہے۔ اگر لیگ اس طرح کے عہد نہیں دے سکتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام لیگ سے اسی طرح لاتعلق رہے گی جس طرح پہلے رہی تھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ، جدید افکار کی روشنی میں اس کی مزید ترویج وترقی میں اس کا ایک حل موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانونی نظام کو اچھے طریقے سے سمجھا جائے اور نافذ کر دیا جائے تو ہر فرد کا کم از کم حق بقا محفوظ ہو سکتا ہے۔ مگر اسلامی شریعت کا نفاذ اور ترویج اس ملک میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہاں آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں قائم نہ ہو جائیں۔ یہ برس ہا برس سے میری ایک دیانت دارانہ رائے رہی ہے، اور مجھے ابھی تک یقین ہے کہ مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ حل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے اور پر امن ہندوستان کے طور پر اس ملک کے تحفظ کا بھی یہی ذریعہ ہے۔

24- Muhammad Asad, *Road to Makkah*, (Islamic book service , Kucha Chelan, Darya Gunj, New De1hi), p-2

25- Road to Mecca, , New Dehli,p -2

26- عرفات کے ۱۹۴۶ تا ۱۹۴۷ء تک شمارے ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد میں محفوظ ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل قائد کا مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ (بہار) ، جنوری ۱۹۳۸ء میں خطاب،[27] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب ۱۹۳۸ء [28] ، پٹنہ میں ۱۰ جنوری ۱۹۳۹ء کو خطاب[29]، عید الفطر ۱۹۳۹ء کے موقع پر بمبئی سے قائد اعظم کا پیغام[30]، آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس، لاہور میں خطاب ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء[31]، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، انڈیا میں خطاب ۱۹۴۱ء[32]، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں سوالوں کے جواب ۱۹۴۲ء، آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس، جالندھر میں صدارتی تقریر ۱۹۴۳ء[33]، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس، کراچی، ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء میں خطاب[34]، مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء[35]، گاندھی جی کے نام خط ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء[36]، برصغیر کے مسلمانوں کے نام عید الفطر کا پیغام، ستمبر ۱۹۴۵ء[37]، فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء[38] پشاور میں خطاب ۲۶ -نومبر ۱۹۴۵ء[39]، پیر آف مانکی شریف کے نام مکتوب، نومبر ۱۹۴۵ء[40]، پریس کانفرنس ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء[41] قائد اعظم کے پیش نظر مسلم معاشرے کی تعمیر نو کے واضح خد و خال موجود تھے ۔ مگر مقالے میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے صرف قائد اعظم کے ان خطابات کے اقتباس نقل کیے جائیں گے جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد فرمائے۔

قیام پاکستان کے بعد اسلامی معاشرے کی تعمیر نو کے بارے میں اقدامات

مجلس دستور ساز پہلے پاکستانی دستوری ادارے کے طور پر وجود میں آچکی تھی، اس کا لائحۂ عمل بھی متعین کر دیا گیا تھا اور قانونِ ہند ۱۹۳۵ء کو عارضی دستور کا درجہ بھی دے دیا گیا تھا۔ مجلس دستور ساز کے اجلاسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے چار اجلاس انتظامی اور ضوابط سازی کے مباحث میں گزر گئے، جن میں دو برس کا عرصہ بیت گیا۔ پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس کے لیے نہایت مشکل حالات پیدا ہو گئے تھے، وہ بھی دستور سازی میں تاخیر کی ایک وجہ بتائے جاتے ہیں۔ بہر حال اس عرصے میں دستور سازی کے لیے فکری معاونت اور ذہن سازی کا سلسلہ جاری رہا۔

قائداعظم اور لیاقت علی خان پہلی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں

27- اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص viii

28- M. A. Jinnah, News clippings, Archives of Freedom Movement (AFM) , (University of Karachi) , vol. 3 March-April 1938.

29- Star of India 11, January 1939,Yusufi: Speeches, Statements & Messages of Quaid-e-Azam 3:1334

30- خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پبلشرز نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۸۳

31- Yusufi:Speeches, Statements & Messages of Quaid-e-Azam, volume-3, p. 1334.

32- https://longlivemusharraf.wordpress.com/2009/12/20/quaid-e-azam-and-holy-quran/

33- خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پبلشرز نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۸۴

34- http://m-a-jinnah.blogspot.com/2010/11/jinnah-was-not-secular.html، قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص viii

35- http://www.siasat.pk/forum/showthread.php?64492-Quotes-of-Muhammad-Ali-Jinnah-Quaid-e-Azam,Speech, Muslim University Union Aligarh 10, March 1944

36- قائد اعظم محمد علی جناح: موہن داس کرم چند گاندھی جی کے نام خط، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء۔ خطباتِ عثمانی، پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پبلشرز نذر سنز، ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۸۳، Letter from M.A. Jinnah to M.K. Gandhi, 17 September 1944, (*Jinnah-Gandhi Talks* (September 1944) (Delhi, 1944

37- قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ix بحوالہ (Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, Ed. Syed Sharifuddin Pirzada, pp.210-211)

38- http://allurdubooks.blogspot.com/2010/12/quaid-e-azam-islam-and-pakistan.html

39- حیاتِ قائد اعظم، قائد اعظم کا مذہب وعقیدہ، قائد اعظم کی تقاریر و بیانات، محدث، شمارہ ۳۳۸، جون ۲۰۱۰ء، قرآن، آئین پاکستان اور قائد اعظم، عطاء اللہ صدیقی۔

40- قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ix بحوالہ (Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence, Ed. Syed Sharifuddin Pirzada, pp.210-211)

41- *Speeches and Statements (1947-48)* , pp.28

ذہن سازی کے لیے علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی تشکیل نو کے طے شدہ پروگرام کے تحت قائدِاعظم کی اپنی تقاریر کا حوالہ بہت اہم ہے جو قیام پاکستان کے وقت سے تسلسل کے ساتھ جاری رہیں۔ پاکستان میں پہلی عید کے موقع پر قائدِاعظم نے قوم کے نام اپنے پیغام ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء میں امید ظاہر کی کہ یہ عید خوش حالی کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوگی، وہ اسلامی تہذیب اور نظریے کی نشاۃ ثانیہ کی طرف بڑھتا ہوا قدم ثابت ہوگی۔[42] آپ نے ۲۵- اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میونسپل کارپوریشن کے عہدے داران کے خطابات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: آیئے ہم اپنی جمہوریت کی اساس سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر قائم کریں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے امور حکومت باہمی بحث و مباحثہ اور مشاورت سے طے کیا کریں۔[43] حکومتِ پاکستان کے سول، نیول، ملٹری اور فضائیہ کے افسران سے خالق دینا ہال کراچی میں خطاب کرتے ہوئے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو فرمایا: جس [مملکت] کو ہم اپنے مزاج اور اپنی ثقافت کے مطابق ترقی دے سکیں، اور جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اصول آزادی کے ساتھ برتے جائیں۔[44] اسی خطاب میں آپ نے فرمایا: اقلیتوں کے لیے اس وقت تک خوف وہراس کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب تک وہ مملکت کی وفادار ہیں۔[45] یونیورسٹی سٹیڈیم روڈ لاہور پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ہر وہ شخص جس کو یہ پیغام پہنچے وہ خود سے عہد کرے اور تیار ہو جائے کہ اسلام کے حصار محکم کی حیثیت سے پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے۔[46] میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو بار ایسوسی ایشن، کراچی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ پاکستان کا دستور شریعت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا۔ یہ اصول آج بھی زندگی میں اس طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو برس قبل تھے۔[47] ریڈیو پر نشریاتی پیغام کے ذریعے ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو امریکی عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میں نے نہیں جانتا دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی، البتہ مجھے یہ یقین ہے کہ وہ جمہوری نوعیت کا ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول مجسم ہوں گے۔[48] سبی دربار سے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اِسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھیں۔[49] ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں ایڈورڈ کالج کے پرنسپل، سٹاف اور طلبہ کے خیر مقدمی خطاب کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: یہ سرزمین عزیز اب ایک آزاد اور خود مختار حیثیت میں ایسی حکومت کے تحت لائی جاچکی ہے، جو اِسلامی ہے، یعنی مسلم حکومت۔[50]

تشکیل نو کے لیے عملی اقدامات

قیام پاکستان کے فوراً بعد تشکیل نو کے عملی اقدامات میں سے ایک اہم قدم ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو دار لحکومت کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد اور اس کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قائدِاعظم کی سربراہی میں کام کرنے والی مجلس دستور ساز کے قانون ساز اجلاسوں میں بحث کرنا اور اقدامات کی ابتدا کرنا ہے۔ اس کانفرنس اور تشکیل نو کے سلسلے میں اس کی ہمہ جہت تجاویز کے بارے میں اسمبلی کی درجِ ذیل بحث قابل غور ہے:

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سفارشات کا عملی نفاذ

جناب نور احمد: کیا عزت مآب وزیر داخلہ یہ بیان کرنا فرمائیں گے کہ ان کی زیر صدارت جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نومبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں کراچی میں منعقد ہوئی تھی، حکومت پاکستان کی طرف سے اس کی سفارشات کو مؤثر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے گئے ہیں یا کیا اقدامات تجویز کیے گئے ہیں،

-42 "http://m-a-jinnah.blogspot.com/2010/03/first-eid-in-pakistan-18th-aug-1947.html "قائداعظم اسپیچز"؛ شائع کردہ پبلسٹی، کراچی، ص ۲۴ کچھ حصہ
Quaid-i-Azam Speaks: Speeches by Quaid-i-Azam Mohd. Ali Jinnah,

-43 قائداعظم اسپیچز، ص ۸۹ (Yusufi: Speeches, Statements & Messages of Quaid-e-Azam 4:2615)

-44 قائداعظم اسپیچز، ص ۲۳ (Yusufi , Speeches, Statements & Messages of the Quaid-i-Azam ,74)

-45 قائداعظم اسپیچز، ص ۳۴

-46 Speech at a Mammoth Rally at the University Stadium, Lahore on 30th October, 1947، قائداعظم اسپیچز، ص ۴۱
http://m-a-jinnah.blogspot.com/2010/03/first-eid-in-pakistan-18th-aug-1947. html. Yusufi, Speeches, Statements & Messages of the Quaid-i-Azam, 94-95

47- Yusufi: Speeches, Statements & Messages of Quaid-e-Azam, 4: 2669

48- Speeches by Quaid-i-Azam Mohamed Ali Jinnah, Governor-General of Pakistan, published by Government of Pakistan printed at Sind Observer Press Ltd, 1948,p.44,Yusufi: Speeches, Statements & Messages of Quaid-e-Azam 4: 2694 (قائداعظم اسپیچز (فروری ۴۸ء)، ص ۹۲)

49- Yusufi, Speeches, Statements & Messages of the Quaid-i-Azam, p.142.

50- *Jinnah: Speeches and Statements 1947-1948,* Introduction by S.M. Burke, Oxford University Press, Karachi, 2000, p. 240

خصوصاً درجِ ذیل سفارشات کے بارے میں:

۱۔ سائنسی اور صنعتی کونسل کا قیام

۲۔ فنی تعلیم کی کونسل کا قیام

۳۔ خواتین کے لیے نرسنگ کے ادارے کا قیام

۴۔ قومی لائبریری اور عجائب گھر کا قیام

۵۔ مطالعۂ اسلام کونسل اور پاکستان اکیڈمی کا قیام

۶۔ پاکستان کی تاریخی دستاویزات محفوظ رکھنے کے لیے کمیشن کا قیام

۷۔ تعلیمی سفاشات کے لیے مرکزی بورڈ کا قیام

۸۔ خواتین کے دو میڈیکل کالجوں کا قیام؛ ایک مشرقی پاکستان میں اور دوسرا مغربی پاکستان میں

۹۔ کالجوں اور جامعات میں لازمی فوجی تربیت متعارف کرانا؛ اور

۱۰۔ مفت لازمی پرائمری تعلیم متعارف کرانا

عزت مآب جناب فضل الرحمٰن: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جن قراردادوں کا حکومت پاکستان کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے، انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے مؤثر اقدامات کیے ہیں۔ باقی رہیں وہ سفارشات جو صوبائی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں آتی ہیں انہیں ان کے علم میں لا کر درخواست کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں یہ اقدامات کیے جائیں، حکومت پاکستان کی قسمتِ تعلیم کو اس سے باخبر رکھا جائے۔ خاص طور پر وہ سفارشات جن کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، ان کی صورتحال درجِ ذیل ہے:

۱۔ یہ قرارداد حکومت پاکستان کامرس ڈویژن (وزارت تجارت وصنعت و تعمیرات) کو بھیج دی گئی ہے، جس کا اس قرارداد کے نفاذ کے ساتھ بنیادی تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ مؤثر طور پر ان کے زیرِ غور ہے، اور مستقبل قریب میں ایک سائنسی اور صنعتی تحقیقاتی کونسل کے قیام کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

۲۔ فنی تعلیم کی کونسل کی تشکیل کا اعلامیہ پہلے ہی ۲۰ فروری ۱۹۴۸ء کو جریدۂ پاکستان میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اور مجلس دستور ساز (قانون سازی مجالس) اس کونسل کے لیے اپنا نمائندہ بھی مقرر کر چکی ہے۔

۳۔ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک سفارش یہ کی تھی کہ جامعات میں خواتین کی نرسنگ کی تربیت شروع کرنے کے لیے جامعات سے درخواست کی جائے۔ اس کے مطابق یہ قرارداد پاکستانی جامعات کے علم میں لائی گئی ہے اور ان سے درخواست کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں جو اقدامات کیے جائیں حکومت پاکستان کو ان سے باخبر رکھا جائے۔

۴۔ اس قرارداد کے بارے میں قابلِ عمل لائحۂ عمل تیار کرنے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے۔ یہ کمیٹی پہلے ہی پاکستان عجائب گھر شروع کرنے کا تفصیلی خاکہ تیار کر چکی ہے۔ یہ عجائب گھر فنون اور آثار قدیمہ پر مشتمل ہو گا جنہیں زمانی اور جغرافیائی ترتیب کے مطابق محفوظ کیا جائے گا۔ یہی کمیٹی قومی لائبریری کے قیام کے لیے ضروری مواد جمع کر رہی ہے۔

۵۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے دو الگ الگ قراردیں پاس کیں؛ ایک ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے قیام کے لیے اور دوسری پاکستان اکیڈمی کے قیام کے لیے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے قیام میں پیش رفت یہ ہے کہ اس کے قیام کے لیے قسمتِ تعلیم میں اسکیم تیار کر لی گئی ہے اور حکومت اس پر توجہ مرکوز کر رہی ہے۔ جہاں تک پاکستان اکیڈمی کے قیام کا تعلق ہے تو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سفارش کے مطابق میری سربراہی میں اس کے لیے ایک تاسیسی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے غور و فکر کے نتیجے میں ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے اور اس پر مؤثر انداز میں غور و فکر جاری ہے۔

۶۔ مستقبل قریب میں تاریخی اور دستاویزاتی ریکارڈ کمیشن کے قیام کے لیے حکومت اقدامات کر رہی ہے۔

۷۔ پاکستان کی سطح پر تعلیمی سفارشات کے بورڈ کے قیام کا اعلامیہ پہلے ہی جریدۂ پاکستان مؤرخہ ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کے لیے حکومتی قرارداد کے نسخے مجلس دستور ساز (قانون سازی مجالس) میں پیش کیے گئے تھے اور مجلس نے بورڈ کے لیے اپنے نمائندوں کا انتخاب کر لیا ہے۔

۸۔ قرارداد صوبائی حکومتوں کو بھیج دی گئی ہے اور ان سے درخواست کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں جو اقدامات کیے جائیں، مرکزی حکومت کو بھی اس سے باخبر رکھا جائے۔

۹۔ قرارداد جامعات اور پاکستان کی صوبائی حکومتوں کے علم میں لائی گئی ہے۔

۱۰۔ قرارداد صوبائی حکومتوں کے علم میں لائی گئی ہے اور ان ریاستوں کے علم میں بھی جو پاکستان کے ساتھ شامل ہو رہی ہیں اور جن سے یہ قرارداد متعلقہ ہے۔

پروفیسر راج کمار چکرورتی: کیا عزت مآب وزیر یہ بیان کرنا پسند فرمائیں گے کہ کیا یہ اکیڈمی مجوزہ اقبال اکیڈمی سے جدا کوئی ادارہ ہو گی؟

عزت مآب فضل الرحمٰن صاحب: جی ہاں[51]

تعلیم کے تمام شعبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ایک ہمہ جہت جامع سکیم تھی جس میں دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، پاکستان اکیڈمی اور اقبال اکیڈمی کے ذریعے ایک خاص مقام دیا گیا تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تعلیم کے باقی شعبے نظریاتی اساس کے ماوراء ہوں گے، بلکہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہر تعلیمی شعبے کی اصل بنیاد نظریاتی روح کے مطابق ہو گی۔ اس سلسلے میں درجِ ذیل بحث اسلامی تشکیل نو کے انداز کی وضاحت کرتی ہے:

پاکستان میں پہلے سے جاری تعلیمی نظام کی اصلاح و ترمیم (Overhauling) کے لیے مجوزہ اقدامات

جناب نور احمد: کیا عزت مآب وزیر داخلہ یہ بیان کرنا پسند فرمائیں گے کہ موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح و ترمیم کے لیے حکومت پاکستان نے کیا اقدامات کیے ہیں، یا کیا اقدامات کرنے کی تجویز بنائی ہے، نیز یہ پورے نظام تعلیم کو ایسی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے کیا اقدامات کیے ہیں جو پاکستان کے بہترین مفاد کے لیے سازگار ہوں۔

عزت مآب فضل الرحمٰن صاحب: حکومت پاکستان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ ایک نئی ریاست کے قیام کا تقاضا ہے کہ تعلیمی مسائل کے بارے ایک نئی سوچ پروان چڑھے، اور اس سے بھی کہ جو تعلیمی نظام پاکستان کو ورثے میں ملا ہے اس کی لازماً اصلاح و ترمیم کرنا ہو گی۔ اسی حقیقت کے احساس نے حکومت پاکستان کو پہلی فرصت میں ایک نمائندہ تعلیمی کانفرنس منعقد کرنے پر آمادہ کیا۔ حکومت اس کانفرنس کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فعال اقدامات کر رہی ہے اور اس مقصد کے لیے کئی ادارے تشکیل دے دیے گئے ہیں، جن میں ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن اور ٹیکنکل ایجوکیشن کونسل بھی شامل ہیں، تاکہ یہ ادارے خاص نوعیت کے تعلیمی مسائل کے بارے میں تفصیلی غور و فکر کر کے لائحۂ عمل پیش کریں۔ کانفرنس نے یہ قرارداد بھی پاس کی تھی کہ پاکستان کے تعلیمی نظام کا محرک اصلی "اسلامی نظریہ" ہونا چاہیے، جس کے دیگر بہت سے مظاہر میں سے خاص کر زور عالمی اخوت، برداشت اور عدل پر ہونا چاہیے۔ حکومتِ پاکستان نے ان سفارشات کو تسلیم کر لیا ہے اور جوں ہی ایڈوائزری بورڈ کام شروع کرتا ہے ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت اس سے مدد لے گی۔ اسی دوران یہ سفارش صوبائی حکومتوں کو پہنچا دی گئی ہے اور ان ریاستوں کی حکومتوں کو بھی جنھوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق اختیار کیا ہے۔ اور ان سب سے درخواست کی گئی ہے کہ اس سفارش کو نافذ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے۔[52]

51- Constituent Assembly(Legislature) 8 March 1948;Implementation of Recommendations of all Pakistan Educational Conference, page: 315- 316

52- Constituent Assembly(Legislature) 8 March 1948;Contemplated Measure to Overhaul present system of education in Pakistan, page:326- 327

ادارہ اسلامی تعمیر نو کا قیام

علامہ محمد اسدؒ ادارہ برائے اسلامی تعمیرنو (مغربی پنجاب) پاکستان کے سٹاف کے ساتھ

قیام پاکستان کے پہلے ہی سال، قریب قریب اسی کانفرنس کے زمانے میں پنجاب حکومت نے لاہور میں ادارہ اسلامی تعمیر نو/ محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ قائم کیا۔ مغربی پنجاب کے سرکاری گزٹ سے ادارے کے ڈائریکٹر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے تقرر کے اعلامیہ نمبر ۱۱۸۹-ایچ- ۴۸/ ۶۸۵۵ مؤرخہ ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء میں علامہ محمد اسد کا بطور ڈائریکٹر تقرر بتاثیر سابقہ تاریخ ۶/ اکتوبر ۱۹۴۷ء بعد دوپہر سے کیا گیا ہے جب کہ ان کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف اسلامک ری کنسٹرکشن کے طور پر ڈاکٹر ایچ ایف الہمدانی کا تقرر ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ء سے کیا گیا ہے۔ اعلامیہ ویسٹ پنجاب گورنمنٹ نوٹی فکیشنز اینڈ آرڈرز، ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جاری ہوا۔[53] مغربی پنجاب قانون ساز اسمبلی کے مباحث کی روداد بابت ۱۵ مارچ تا ۹/ اپریل ۱۹۴۸ء میں درج سپلیمنٹری ڈیمانڈ کے عنوان سے ہونے والی بحث میں جناب سپیکر نے جنرل ایڈمنسٹریشن کے لیے علامتی بجٹ کی ڈیمانڈ دس روپے پیش کی، اسی بجٹ میں ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن کا بجٹ برائے سال ۴۸- ۱۹۴۷ء بھی شامل تھا اور یہ ڈیمانڈ منظور کرلی گئی۔[54] بجٹ برائے سال ۱۹۴۸- ۴۹ء اور ۱۹۴۹- ۵۰ دونوں میں سے ہر سال کی کل رقم ۷۴۴۴۰/ چھہتر ہزار چار سو چالیس روپے تھی۔[55] ادارے کا دفتر لاہور میں اس مقام پر تھا جہاں اب پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اقامت گاہ "پیپل ہاؤس" ہے۔[56] ادارے کے رفقائے کار میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا جعفر شاہ پھلواری، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر حسین الہمدانی، مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی اور مظہر الدین صدیقی کے اسماءِ گرامی شمار کیے ہیں۔[57] ان کے علاوہ ایس ایم انور ملک اِنعام خان، محمد علی اظہر، غلام حسن، ایس ایم اصغر، سید شبیر احمد، محمد شفیق الرحمٰن، ایس ایم حسن، افتخار احمد چشتی، ایس ڈی خواجہ، دین احمد، عبدالقادر، امانت خان، بدر دین، اور اسرار کے نام بھی اس ادارے سے منسلک ملتے ہیں۔ اس ادارے کا کام ریاست گری اور معاشرہ سازی کے اِسلامی نظریاتی تصورات کو اجاگر کرکے پیش کرنا تھا جن پر نئی وجود میں آنے والی سیاسی منتظمہ اپنے وجود کا خاکہ پیش کرنے والی تھی[58]۔ اِس کے قیام کا بنیادی مقصد زندگی کی اِسلامی خطوط پر تعمیرِ نو کے لیے اپنے معاشرے کی مدد کرنا بتایا گیا۔[59] یہ ادارہ لاہور میں قائم ہوا اور اس کی ابتدائی منظوری وزیر اعلیٰ پنجاب نے دی مگر یہ پورے ملک کے لیے کام کرتا تھا۔[60] ۲۲ مارچ ۱۹۵۰ء تک یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ علامہ اسد ادارہ اسلامی تعمیرِ نو/ ادارہ احیائے ملت اسلامیہ کے سربراہ رہے[61] اس کے بعد ادارے کے احوال کا پتا نہیں چل سکا۔ گویا ۱۹۴۹ء میں قرار دادِ مقاصد پیش ہونے اور پاس ہونے کے بعد بھی یہ ادارہ کم از کم ایک سال تک قائم اور مکمل طور پر فعال تھا۔

53- Part1, West Punjab Government Notificatios and Orders, GAZZETE, Appointments, Postings and Transfers, The 18th February 1948, No, 1189-H-48/6855, Page 65 Table of Contents to the West Punjab Legilative Assembly Debates From 15 March to 9th April 1948, VolumII,

54- Official Report: Suplimentary Demand, Page:131

55- ریکارڈ بجٹ، پنجاب آرکائیوز، لاہور، نمبر E-7، 9702 و 9704

56- مولانا اسحاق بھٹی، ارمغانِ حنیف (لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸۹)، ص ۱۱۶۔

57- ڈاکٹر محمد ارشد: اسلامی ریاست کی تشکیل جدید، ص ۱۶۲، حاشیہ نمبر ۱۷۸ میں بحوالہ مولانا اسحاق بھٹی، ارمغانِ حنیف (لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸۹)، ص ۱۱۶۔

58- Road to Mecca, p2

59- ادارۂ اسلامی تشکیلِ نَو کے اغراض ومقاصد (انگریزی)، محمد اسد، صفحہ نمبر ۱، پیرا نمبر ۱، سطر ۱

60- بجٹ ۱۹۴۸-۴۹ لائبریری کاپی، صفحہ ۲۲۹ اور بجٹ ۱۹۴۹ -۵۰ لائبریری کاپی، صفحہ نمبر ۹۹ WestPakistan Civil Secretaiate, Library copy(to be returned to the Library when done with), BUDGET 1948-49, with detailed estimate of Revenue and Expenditure, Presented to the Legislative Assembly by order of His Excelency the Governor, Lahore, Printed by the Suprintendent, Government Printing, West Punjab 1948

61- ڈاکٹر زاہد منیر عامر, First Wind of Islamic Revivalism after World War II:Muhammad Asad (1900–92) and International Islamic Colloquium, 1957–58, Kyoto and International Islamic Colloquium, 1957–58, Kyoto Bulletin of Islamic Area Studies, 8 *Tareekh e University Oriental College*, pp. 228–229 بحوالہ (March 2015), pp. 88–102

ادارے کے ڈائریکٹر علامہ اسد کہتے ہیں:

> اسلامی فکر و عمل کا احیاء اور وہ بھی صدیوں کے زوال وانحطاط کے بعد کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کے لیے اس ملک کے بہترین دماغوں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ اس کے لیے پوری تفاصیل کے ساتھ ایک قطعی دستور العمل کا نقشہ تجویز کردیں؛ لہٰذا ہماری سرگرمیوں کی حتمی شکل اسی وقت متعین ہو سکے گی جب محکمے کی مکمل تشکیل پالیسی سازی کے معاون ادارے کے طور پر ہو جائے گی اور معتبر رائے عامہ کے ساتھ وہ اپنا تعلق قائم کرلے گا۔ اس لیے ذیل میں جو خاکہ دیا گیا ہے، وہ محض اس میدان عمل کا تعین کرنے کی کوشش ہے جس میں ہم اسلامی تعمیرِ نو کا کام شروع کرنے کی تجویز دے رہے ہیں۔

مزید توضیح مطلب کی خاطر، ہمارے مقاصد چند ذیلی عنوانات کے تحت یہاں درج کیے جارہے ہیں:

۱۔ تعلیم

محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کے جملہ فرائض میں سے ایک یہ بھی ہوگا کہ کارپردازانِ تعلیم کے سامنے، وقتاً فوقتاً، ایسی تجاویز پیش کرتا رہے گا، جو اس مقصد سے تشکیل دی گئی ہوں گی کہ ہمارے کالج اور اسکول اس نئی زندگی کا پورا پورا نمونہ بن سکیں، جسے اپنانے کا ملت نے فیصلہ کیا ہے۔ ان تجاویز کا تعلق نصابِ تعلیم، درسی کتب، اور متعلقہ مواد سے ہوگا۔ اس کے علاوہ اس عمومی رویے سے بھی ہوگا جو ہماری درسگاہوں میں اسلامی لحاظ سے اختیار کیا جانا چاہیے۔ مسلمان طالب علموں کے لیے دینیات کی تعلیم لازم قرار دی جائے گی۔ وہ ابتدا سے انتہا تک قرآن وحدیث کے باضابطہ مطالعے پر مشتمل ہوگی——اوپر کے تعلیمی مراحل میں اصول تفسیر و تشریح کا مطالعہ بھی اس میں شامل ہوگا——اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ——طلبہ کی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطالب و مفاہیم کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے——اور اس کے ساتھ ساتھ——اپنے نصاب کے آخری مراحل میں وہ ان بنیادی ذرائع کے مطالعہ کے ان اسالیب اور طریقہ ہائے استدلال سے بھی واقف ہو جائیں، جو مختلف اسلامی مکتب ہائے فکر کے ہاں مروج رہے۔ اس مرحلے تک، دینیات کے نصاب میں ابتدائی اسلامی تاریخ کا بہت مفصل، تنقیدی مطالعہ بھی شامل کیا جائے گا۔ یہ حصہ تاریخ اسلام کے اس نصابی حصے سے الگ ہوگا جو عام تاریخ کے نصاب میں شامل ہوگا۔ اسی طرح، اسلامی فلسفے کی مختلف شاخوں کا مطالعہ بھی دینیات کے نصاب میں شامل کرنا ہوگا، اور یہ حصہ فلسفے کے عام مطالعہ پر مشتمل مضمون سے الگ ہوگا۔ نئے نصاب کے آخری مراحل میں، نظام اسلام کا بحیثیت مجموعی، معاشیات اور معاشرتی علوم کی روشنی میں دورِ جدید کے مختلف مسائل کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ان تمام اقدامات سے رفتہ رفتہ ہم پورے تعلیمی نظام کو اسلام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی غرض سے خود بخود اپنے تعلیمی مقاصد کی تشکیل نو کرلیں گے۔ فطری سی بات ہے کہ اس قسم کی تشکیل نو یکدم کر لینا ممکن نہیں۔ مشکلات بہت زیادہ اور اس قدر گہری ہیں کہ ان پر انتہائی احتیاط سے غور وفکر اور ان کا جائزہ لینے کا کام محققین کی مختلف کمیٹیوں کے سپرد کرنا پڑے گا، جو اپنے وقت پر اس مقصد کے لئے قائم کی جائیں گی اور وہ ان تجاویز پر غور وخوض کریں گی جو مقتدر شخصیات کو پیش کرنے کے لیے تیار کی گئی ہوں گی۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹیں جونہی تیار ہو جائیں گی انہیں شائع کردیا جائے گا۔

ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ ممتاز ماہرین تعلیم اور فضلاءِ علومِ شرقیہ کی بھی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور اسے یہ ہدف دیا جائے کہ (الف) یہ طے کرے کہ آیا عربی زبان کو اسکولوں اور کالجوں میں لازمی قرار دینا چاہیے اور (ب) اگر ایسا کرنا ضروری ہے تو اس مقصد کے لئے ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جو ہر لحاظ سے قابل عمل ہو۔ پھر ان امور کے علاوہ جن کا تعلق نصاب تعلیم سے ہے، محکمہ احیائے ملت اسلامیہ سکولوں کی زندگی کو اسلامی نظام زندگی کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے تجاویز پیش کرے گا۔

۲۔ اسلامی قانون اور معاشرتی تشکیلِ نو

اس وقت ملت کے درمیان جو سب سے بڑا پریشان کن تذبذب پایا جاتا ہے وہ اس بات میں ہے کہ کیا "اسلامی" ہے اور کیا "غیر اسلامی"، اور بے یقینی کی یہ کیفیت تمام سماجی و معاشی منصوبوں اور تجاویز میں ہے۔ اس معاملے میں جو اختلافات مختلف مکتب ہائے فکر کے درمیان- جدید اور قدیم دونوں میں- پیدا کیے جارہے ہیں، جو زیادہ تر، قرآن وسنت کی تعبیر و تشریح کے طریقوں اور اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی پیداوار ہیں۔ اسلامی اقدامی عمل (Islamic action) کا کوئی ایسا لائحہ عمل ترتیب دینا ناممکن ہے جو تمام موجود مکاتب فکر یا کم از کم اکثر مکاتب فکر سے اپنا آپ منوا سکے۔ فی الحال ہمیں ان تمام امور سے قطع

نظر کرنا ہو گا، جن میں تعبیر اور استنباط کی ضرورت ہے، اور ہمیں صرف ان شرعی قوانین پر توجہ مرکوز کرنا ہو گی جو بذاتِ خود واضح ہوں اور اسی وضاحت کے ساتھ قرآن وسنت کے ظاہری الفاظ پر مشتمل ہوں، اور ان کے بارے میں مختلف اسلامی مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ اگر ایسے قوانین کی تدوین ہو جائے، تو ان سے اسلامی معاشرتی تعمیرِ نو کا مقصد حاصل کرنے کے لیے کم از کم متفقہ بنیاد میسر آ جائے گی۔

لہٰذا، اس محکمے کی تجویز ہے کہ، تمام مکاتبِ فکر کے معتبر علماء سے درخواست کی جائے، اور وہ اپنے قابل ترین نمائندے، مستقبل میں زیر تشکیل ایک شریعت کمیٹی کے رکن بننے کے لیے نامزد کریں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہو گا کہ قرآن وسنت کے ان معاشی اور اجتماعی احکام کی تدوین اور ضابطہ بندی کرے جنھیں نصوص کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے اور ان کے الفاظ کے واضح ہونے کی وجہ سے ان کی کسی اختلافی تعبیر و تشریح کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اس عمل سے نئے شرعی قوانین "وضع کرنے" یا پہلے سے موجود شرعی قوانین کو ہی "نئے سرے سے وضع کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حوالے کی جو شرائط کمیٹی کو جاری کی جائیں گی، ان کے مطابق کمیٹی صرف قرآنِ مجید اور معتبر روایات، جو تمام مکاتبِ فکر کے ہاں قابل قبول ہوں، سے معلوم ہونے والے مجموعی احکام کو جمع کرے گی، اور خاص عناوین کے تحت ان کی ضابطہ بندی کر دے گی۔ امید ہے کہ اس طریقے سے نسبتاً مختصر حجم کا ایک ضابطہ میسر آ جائے گا، جسے مختلف مسلم مکاتبِ فکر کے درمیان ایک غیر فرقہ وارانہ قدر مشترک قرار دیا جا سکے گا۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو، ملت کے پاس معاشرتی اہمیت سے متعلقہ سوالات کے بارے میں ایک کم از کم شرعی ضابطہ مہیا ہو جائے گا، جو بعد میں مزید غور و فکر کی بنیاد اور عملی قانون سازی کے نقطہ آغاز کا کام دے سکتا ہے۔

۳۔ اسلامی قانون اور معاشیات

ایک اور کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو اسلامی علماء اور ماہرین معیشت پر مشتمل ہو گی اور اس کا کام ہماری معاشی زندگی کی اسلامی خطوط پر مناسب انداز میں تشکیل و ترقی کے لیے عملی تجاویز پیش کرنا ہو گا۔ اس کے لیے مواد اسی طرح بنیادی شرعی قوانین پر مشتمل ہو گا جس طرح پہلی کمیٹی میں تجویز کیا گیا۔ اس کے لیے حوالہ جاتی مآخذ کے طور پر معاصر معاشی مسائل کا انتخاب کر کے ان کے اِسلامی قانون کے ساتھ ربط کا مطالعہ شامل ہو گا۔ مثال کے طور پر بینکنگ، لائف انشورنس، کریڈٹ کے ذریعے کیے جانے والے معاملات، اجتماعی ضروریات کے تحت ذاتی ملکیتی جائدادوں کا حصول، زرعی اصلاحات (اس میں اراضی کو قومیانے کے مسائل بھی شامل ہیں)، اور وراثت کے قوانین وغیرہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کمیٹی کا مقصد کوئی متعین اور "واضح اقتصادی منصوبہ بندی" کر کے پیش کرنا نہیں ہو گا، یہ کام تو ریاست کے دیگر اداروں کو کرنا چاہیے۔ مذکورہ بالا کمیٹی سے صرف یہ توقع ہو گی کہ: (أ) مخصوص معاشی مسائل کے بارے میں اِسلامی قانون کی رائے واضح کرے، (ب) دورِ جدید کی روزمرہ معاشی ضروریات کو اسلامی نقطۂ نظر پر تشکیل کردہ معاشی نظام میں کیسے سمویا جا سکتا ہے؟ کمیٹی کی پیش یہ تجاویز ریاست کی باقاعدہ تشکیل شدہ مجالس قانون ساز کو پیش کی جائیں گی۔

۴۔ اوقاف کا مربوط نظام

اس ملک میں بے شمار اوقاف اور مذہبی ادارے ہیں، ان میں سے کئی ایک کی خاطر خواہ آمدن ہے۔ یہ اوقاف مختلف اوقات میں عبادت، تعلیم اور معاشرتی خدمات سے متعلقہ آبادی کے رفاہ اور اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ بہت سے مخلص مسلمانوں کی طرف سے تسلسل کے ساتھ یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اوقاف کی ان جائدادوں کی مرکزی سطح پر ایک مقتدرہ کے ماتحت تنسیق کر دی جائے —— جو ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی —— تاکہ بد انتظامی اور بے نتیجہ تکرارِ عمل سے ہونے والے نقصان کا سدباب کیا جا سکے۔ اگر یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے تو قوم کو مرکزی سطح پر آمدن کا ایک بڑا ذریعہ میسر آ جائے گا، جسے ان صالح لوگوں کی خواہش کے مطابق، جنھوں نے ماضی میں یہ اوقاف قائم کیے تھے، مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے خرچ کیا جا سکے گا۔

متعلقہ اداروں کی جائز ضروریات پوری کرنے کے بعد، بقایا رقم کو علماء کی ایک عظیم اکیڈمی قائم کرنے اور چلانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے (یہ اکیڈمی قاہرہ کی جامعہ ازہر کی طرز پر بھی ہو سکتی ہے)، جو نسل در نسل اسلامی محققین پیدا کرے گی اور پاکستان کو مسلم دنیا کے لیے ایک روحانی مرکز بنانے میں مدد دے گی۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کی تجویز ہے کہ کچھ ممتاز علماء اور اچھی شہرت کے حامل شہریوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ یہ کمیٹی شرعی نقطۂ نگاہ سے اوقاف املاک کے مسئلے کا جائزہ لے، اور اس کے متعلق تمام نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لینے کے بعد، ملک کے تمام وقف املاک کو ایک مرکزی مقتدرہ کے تحت باہم مربوط بنانے کے لیے ٹھوس لائحۂ عمل تیار کر کے پیش کرے۔

۵۔ اجتماعی اخلاقیات/معاشرتی خوداعتمادی Civic Morale

ہماری معاشرتی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو ہماری اخلاقیات کی دینی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے تباہی ہے۔ اگر پاکستان نے اپنا مقرر کردہ ہدف حاصل کرنا ہے اور اسلامی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بننا ہے تو معاشرتی خود اعتمادی/ اجتماعی اخلاقیات کی خدمت کے لیے تمام سلیم الفکر مسلمانوں کا مؤثر باہمی تعاون یقینی بنانا ہوگا۔ ورنہ، شاید حکومت کی انتہائی نیک نیتی بھی ملت کے مظہر میں وہ تبدیلی نہ لاسکے جو صحیح معنوں میں ہمارے ملتِ اسلامیہ بننے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر ہم دوسری دنیا کو عدل کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم خود ان لوگوں کے ساتھ عدل کا رویہ اختیار کرنا سیکھیں جو کمزور ہیں، تاکہ ہم درست چیزوں پر عمل کرنے اور غلط کاموں سے باز رہنے کے قابل ہو جائیں، ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ اپنا محاسبہ اس سے بھی سخت کیا کریں جتنا سخت محاسبہ ہم دوسروں کا کرنا چاہتے ہیں؛ اسی طرح روحانی خوشی حاصل کرنے کے لیے، ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ جتنا اب ہم مادہ پرست ہیں، اپنی مادہ پرستی کو اس سے کہیں زیادہ کم کردیں۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ اس دعوت کو جس کا تعلق عملی اسلام سے ہے، اس ملک میں ہر ایسے مرد اور عورت تک پہنچانا اپنا فرض اولیں سمجھتا ہے جو غور کرتے ہیں: کیوں کہ، اگر ہم فی الواقعہ مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو، ہمیں چاہیے کہ، سب سے پہلے، مسلمانوں کی طرح غور و فکر کرنا سیکھیں۔ چناں چہ اس محکمے کا پروگرام ہے کہ خوب غور و فکر کے بعد تیار کیے گئے دستور العمل کے مطابق ان معاشرتی، اخلاقی اور فکری مسائل کے متعلق جو آج ملت کو درپیش ہیں، تسلسل کے ساتھ مطبوعات شائع کرے۔ پھر ان مختلف کمیٹیوں کی روئیدادوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا تھا، ہم (الف) نامور مسلمان مفکرین کے لکھے ہوئے کتابچوں، (ب) اخبارات میں مضامین اور (ج) ریڈیو تقریروں کی ایک تسلسل کے ساتھ اشاعت کریں گے۔ جن کا تعلق اسلامی تعمیرِ نو کے تازہ ترین مسائل سے ہوگا۔

ہم درسِ قرآنِ مجید کا ایک منظم سلسلہ شروع کریں گے، جس کے تحت پابندی کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے درسِ قرآنِ مجید نشر ہوا کرے گا؛ اس سلسلے میں ہم ممتاز اہل علم کا تعاون بھی حاصل کریں گے، جو ہمارے موجودہ مسائل اور مشکلات کے خصوصی حوالے سے تعلیمات قرآنِ مجید کی تفہیم کیا کریں گے۔ اور اس طرح وہ قرآنِ مجید سے عملی رہنمائی حاصل کرنے میں قوم کے مددگار ثابت ہوں گے۔ آگے چل کر بھلے وقتوں میں، جب ہمارے محکمے کی تنظیم مکمل ہو جائے گی، تو ہم مساجد اور عام اجتماعات کے ذریعے جمہور مسلمانوں سے رابطہ پیدا کریں گے۔ جو صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ اس سے ایسی اسلامی ریاست کی تعمیر کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے ملت کے روحانی وسائل کو مہمیز ملے گی، جو اس مقدس نام کے مطابق اسلامی ریاست کہلانے کی واقعتاً حق دار ہو، اور ہم اپنے اس روحانی تنزل اور اخلاقی و سماجی بدعنوانی کو ختم کرپائیں گے جس نے محکومیت کے زمانے سے ہی ملت کے دِل کو سیاہ کردیا ہے۔

یہ مقاصد ہیں جن کے تحت، محکمہ احیائے ملت اسلامیہ وقتاً فوقتاً حکومت کے سامنے معاشرتی اصلاح کی مختلف تجاویز پیش کرتا رہے گا۔ ان میں وہ تجاویز بھی ہوں گی جن پر کوئی خاص قانون وضع کیے بغیر فوراً عمل کیا جاسکے گا، اور وہ تجاویز بھی جن کے لیے ہمیں کچھ نئے قانون وضع کرنے پڑیں گے۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کا یہ بھی خیال ہے کہ کچھ عرصے کے بعد، اسلامی تعمیرِ نو کی علاقائی کونسلیں بھی قائم کرے، جن کی ابتدا لاہور سے ہوگی اور رفتہ رفتہ ان کا سلسلہ پورے ملک میں پھیل جائے گا۔ ان میں وہ ممتاز شہری اور سماجی کارکن بھی شامل ہوں گے جو ہمارے اس مشن میں ہماری مدد کرنے کے لیے آمادہ ہوں کہ، اس کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جذبے کے ایسے متحرک مقام پر لانے تک پہنچ جائے، جو ایک صحیح اسلامی نظام سیاست کی تعمیر میں سرگرمی سے حصہ لینے والے ہوں۔

اہم سرگرمیاں

قیامِ پاکستان کے سال ۱۹۴۷ء کے ماہ ستمبر میں علامہ محمد اسدؒ نے Calling all Muslims (ندا برائے جملہ مسلمانان) کے عنوان سے سات نشری تقریریں کیں۔[62] جن میں معاشرے کی اصلاح، حکمرانوں کے ساتھ تعاون اور پاکستان کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کے لیے مختلف پہلوؤں پر مدلل گفتگو کی۔

علامہ محمد اسدؒ نے محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۸/ اگست ۱۹۴۸ء کو انگریزی زبان میں ایک یادداشت بابت پاکستان میں نفاذِ شریعت (MEMORANDUM: ENFORCEMENT OF SHARIAH IN PAKISTAN, 18 August, 1948) کے عنوان سے مرکزی حکومت کو بھیجی۔[63]

62 - ARAFAT 1948, Volume No.1, p.86 108، اس شمارے کے صفحہ نمبر ۸۶ کے حاشیے پر یہ عبارت لکھی ہے: By Courtesy Radio Pakistan. The above talks were delivered in September, 1947۔ یہ ان تقاریر کی پہلی اشاعت تھی، پھر انہیں علامہ کی بیوہ پاولا حمیدہ صاحبہ نے This Law of Ours and Other Essays کے ضمن میں Islamic Books Trust Kuala Lumpur, Malaysia سے سن ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔

63 - چوہدری مظفر حسین کے پیش لفظ کے ساتھ بزم اقبال کے سہ ماہی مجلہ "اقبال"، جلد ۴۵، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۹۸ء نے صفحات ۱تا۲۲ میں دوبارہ شائع کیا۔

جس میں نفاذِ شریعت کے بارے میں اٹھائے جانے والے شکوک وشبہات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور ادارہ اسلامی تشکیلِ نو/ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کی طرف جدید دور کے تقاضوں کے مطابق شریعت کے نفاذ کے بارے میں کیے جانے والے کام پر روشنی ڈالی۔[64] اسی میں انہوں نے ایک مرکزی اسلامی دارالعلوم کے قیام کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہوئے جنوری ۱۹۴۸ء، میں مغربی پنجاب کی حکومت کی طرف سے ایک عصری دارالعلوم قائم کرنے کے لیے پلاننگ کمیٹی کے قیام کا بھی ذکر کیا جس کا سربراہ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو بنایا تھا اور مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد علماء اور جدید تربیت یافتہ علماء کو اس میں خاص جگہ دی تھی۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ادارے کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور اس تین شعبوں میں کام کرنے کا پروگرام ذکر کیا: جن میں شعبۂ تحقیق، شعبۂ تعلیم، شعبۂ تبلیغ ونشرواشاعت اور شعبۂ اصلاحاتِ قانون سازی شامل تھے۔ ان شعبوں نے ادارے کی طرف سے تجویز کردہ کمیٹیوں کی مدد کرنا تھی۔ اس وقت وہ قانون زکوٰۃ کا مسودہ تیار کر رہے تھے، جس میں زکوٰۃ کی وصولی سے لے کر ریاست اور قوم کی فلاح وبہبود پر خرچ کرنے کا پورا انظام شامل تھا۔ آخر میں انہوں نے اسلامی حکومت اور جدیدیت کو ساتھ ساتھ چلانے کے لیے ٹھوس دلائل دیے اور کچھ روایتی علماء کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔[65]

علامہ اسد کا تحقیقی مجلہ "عرفات" ۱۹۴۸ء سے ادارہ اسلامی تشکیلِ نو/ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کا ترجمان قرار پایا اور مارچ ۱۹۴۸ء کا شمارہ دو زبانوں؛ انگریزی اور اردو میں باقاعدہ سرکاری حیثیت سے شائع ہوا۔ اس کے مضامین اسلامی تشکیل نو کے فکری اور عملی خاکوں کے علمبردار تھے۔

دستور کی خاکہ سازی اور تاخیر کی وجہ

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی

مجلس دستور ساز پاکستان کے پہلے چار اجلاسوں میں مختلف انتظامی اور ضابطہ کار سے متعلقہ بحثیں ہوتی رہیں۔ پانچواں اجلاس ۷-۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء ہوا۔ اس اجلاس میں مرکزی حکومت کی طرف سے دستور سازی کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا۔ پہلا قدم قرارادِ مقاصد کی تقدیم اور توثیق کا تھا۔ جس میں حاکیت اعلیٰ، حاکیت کی نمائندگی اور اقلیتوں کے حقوق سمیت اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کے نمایاں خدوخال طے کر دیے گئے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد پاس ہوئی اور اسی روز دستور کے بنیادی اصول طے کرنے کے لیے مجلس دستور ساز کے اندر ایک کمیٹی بنادی گئی، جس کا نام Basic Principles Committe یعنی بنیادی اصولوں کی کمیٹی رکھا گیا اور اس کے ذمے کام یہ لگایا گیا کہ "قراردادِ مقاصد کی روشنی میں دستور کے اصول طے کر کے پیش کرے"۔ اس سے قبل محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کی طرف سے دستور کا خاکہ پیش کیا جا چکا تھا۔ محکمے کے ڈائریکٹر علامہ اسدؒ نے اسی خاکے کے حوالے سے ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور ان کی زبانی دستور سازی میں تاخیر کی وجہ بتائی۔[66]

64- عرفات اردو، جلد ا، عدد ا، مارچ ۱۹۴۸ء، جمادی الاول ۱۳۶۷ھ، ص ۱۷- ۲۴؛ عرفات انگریزی: مارچ ۱۹۴۸ء، عدد ا، ص ۱۱- ۱۲۔

65- اقبال، بزم اقبال کا سہ ماہی مجلہ، جلد ۴۵: شمارہ: ۳، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳

66- محمد اسد، پولا حمیدہ اسد؛ محمد اسد بندۂ صحرائی، ص ۱۱۳، ۱۱۴
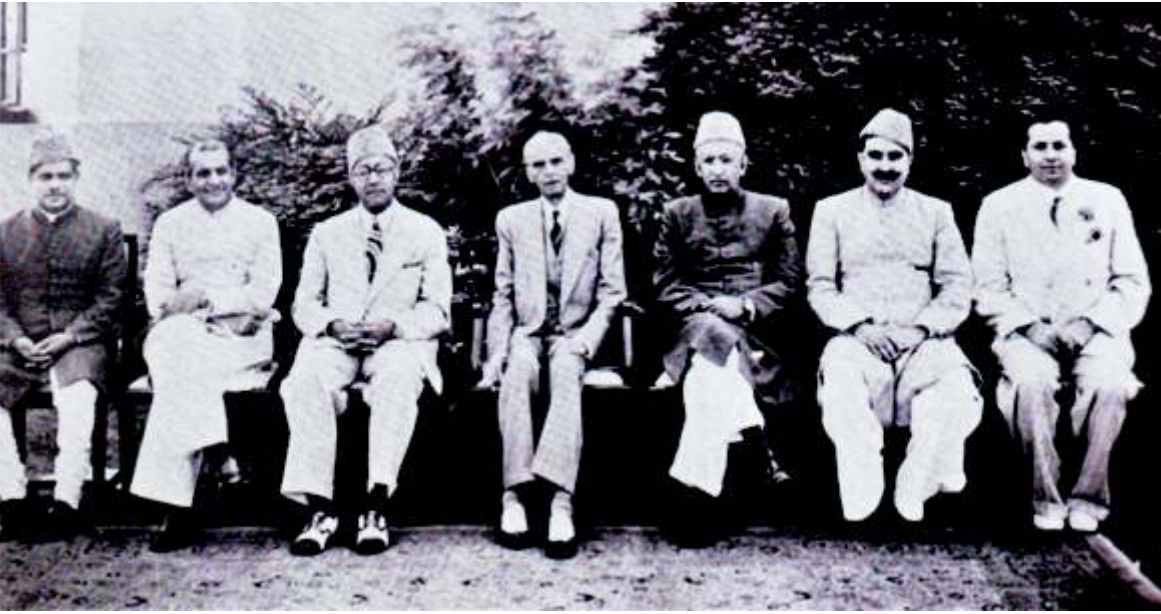
پاکستان کی پہلی کابینہ کے اراکین (۱۹۴۷ء)

تعلیم کی اسلامی بنیادوں پر تعمیرِ نو

۴مارچ ۱۹۴۹ء کو وزیر داخلہ جناب فضل الرحمٰن نے مجلس دستور ساز میں بجٹ کی بحث پر پاکستان کی تعلیمی پالیسی کا رخ متعین کرتے ہوئے فرمایا:

> On the recommendation of the Pakistan Educational Conference and the Central Advisory Board of Education Government have accepted that education should be based on Islamic ideology.[67]

" پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس [۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء] اور سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی سفارش پر حکومت نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ تعلیم کی بنیاد اسلامی نظریے پر ہو گی۔"

اس سلسلے میں ریاستی سطح پر کئی اقدامات ہوئے۔ انہی اقدامات میں سے اعلیٰ دینی تعلیم کا انتظام کرنے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسے ڈگری پروگرام بنانے کے سلسلے میں پہلا باقاعدہ قدم یہ اٹھایا گیا کہ پنجاب یونیورسٹی (قائم شدہ ۱۸۸۲ء) میں ۱۹۴۹ء میں شعبۂ اسلامیات قائم کیا گیا۔ جس کا مقصد اس نئی ریاست کی سماجی، قومی اور مذہبی ضروریات کو پورا کرنا تھا، جسے دنیا بھر میں سب سے بڑی مسلم ریاست کا مقام ملنے والا تھا۔[68] پنجاب یونیورسٹی کے بعد پاکستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے شعبے قائم ہو گئے جو کہ تسلسل کے ساتھ علوم اسلامیہ میں اعلیٰ تعلیم مہیا کر رہے ہیں۔ کام صرف اتنا باقی ہے ان فضلاء اور فاضلات کے علم و تجربے سے فائدہ اٹھانے کا مربوط اور منظم انتظام ہو سکے۔

مجلس دستور ساز کی کاوشیں

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے ۱۹۴۹ء میں اپنی تشکیل سے ۱۹۵۴ء تک تین رپورٹیں پیش کیں، چوتھی رپورٹ میں دستور کا مسودہ تقریباً مکمل کر کے پیش کر دیا گیا اور اس کی خواندگی کر لی گئی مگر بطور دستور اس کے اجراء سے قبل گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب نے اسمبلی توڑ دی، جس سے یہ تمام کام کالعدم ہو گیا۔

67- Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 4 March 1949, p.371

68- http://pu.edu.pk/home/department/64/Department-of-Islamic-Studies بتاریخ ۷ جون ۲۰۱۶ء۔ یہاں علامہ علاءالدین صدیقی کو شعبے کا پہلا سربراہ بتایا گیا ہے۔ اگرچہ علامہ صاحب کی شعبے کی ترتیب تقویت اور نشوونما میں بڑی خدمات ہیں مگر شعبے کے پہلے سربراہ علامہ محمد اسد اور دوسرے صدر علامہ علاءالدین تھے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے دستور کے بنیادی اصولوں کو قراردادِ مقاصد کے دائرے کے اندر رکھنے کے بارے میں بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ : (۱۹۴۹ - ۱۹۵۴ء) قائم کیا جس کے چیئرمین سید سلیمان ندوی اور ارکان مفتی محمد شفیع، پروفیسر عبدالخالق، مولانا محمد ظفر احمد انصاری، مفتی جعفر حسین مجتہد تھے۔[69] اس بورڈ نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں کام شروع کیا۔ اس وقت تک سید سلمان ندوی نے عہدۂ صدارت سنبھالا نہیں تھا۔[70] بورڈ کے فرائضِ منصبی یوں بیان کیے گئے :

(۱) قراردادِ مقاصد سے معلوم ہونے والے دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے مشورہ دینا۔

(۲) بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی طرف سے بورڈ کو بھیجے گئے معاملات میں مشورہ دینا۔

(۳) کسی دوسری کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے معاملات میں مشورہ دینا۔

(۴) کسی ذیلی کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے معاملات میں مشورہ دینا[71]۔

مجلس دستور ساز کی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ پہلی مجلس دستور ساز کے اختتام ۱۹۵۴ء تک قائم رہا۔[72] بورڈ نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو قراردادِ مقاصد کے تحت دستوری اصول طے کرنے میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ہر طرح سے مدد دی۔[73] بورڈ آف تعلیمات اِسلامیہ کی تجاویز سربراہ ریاست کے عمومی اور خصوصی اختیارات، سربراہ ریاست کے تقرر کے طریقہ کار، مقننہ کے فرائض منصبی اور آئینی اختیارات، ہنگامی قوانین اور کس طرح مسلمان اپنی زندگیاں قرآن وسنت کے مطابق گزار سکیں سے متعلق تھیں[74]۔

لاء کمیشن (۱۹۵۰ء - ۱۹۵۴ء)

۱۹۵۰ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے اور ان کو اسلامی قانون کے معیار پر لانے کے لیے ایک لاء کمیشن مقرر کر دیا۔ جس کے رکن جسٹس عبدالرشید، جسٹس میمن، سید سلیمان ندوی اور مفتی محمد شفیع صاحب بنائے گئے۔[75] کمیشن کے فرائضِ منصبی اور دائرۂ کار میں درجِ ذیل امور شامل تھے :

(اُ) حکومت نے یہ لاء کمیشن موجودہ قوانین کی چھان بین کرنے اور حسب ضرورت ان میں ترامیم تجویز کرنے کے لیے تشکیل دیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ ان قوانین کو قراردادِ مقاصد کے اصولوں کے مطابق بنایا جائے۔

(ب) کمیشن کا مقصد کسی خاص طبقے کے لیے مؤثر قوانین میں ترامیم تجویز کرنا نہیں تھا، البتہ اقلیتوں کے شخصی قوانین سے تعرض کرنا اس کے دائرہ کار میں شامل نہیں کیا گیا۔[76]

(ت) حکومتی استفسارات بھی کمیشن کو بھیجے جاتے تھے۔ اور کمیشن اس دائرہ کار کے اندر کام کرتا رہا۔[77]

-69 سید صاحب اس وقت بھوپال میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے اس لیے فوری طور پر پاکستان نہ پہنچ سکے۔ بعد میں مولانا احتشام الحق تھانوی کی کوششوں سے جون ۱۹۵۰ء میں پہنچے۔ ماہنامہ حق نوائے احتشام، کراچی، اشاعت خاص: دستور پاکستان نمبر، جلد نمبر ۱۱، شمارہ ۷، ۸، جولائی اگست ۲۰۰۹ء، ص ۳۲، بحوالہ تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، ص ۲۰۶۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس بورڈ سے بطور رکن وابستہ رہے۔ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی، منشی عبدالرحمن، ص ۱۷۳۔

-70 کارروائی مجلس دستور ساز پاکستان، جلد ۸، شمارہ: ۱، ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۳، ۱۴۔

-71 کارروائی مجلس دستور ساز پاکستان، جلد ۸، شمارہ: ۱، ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۳، ۱۴۔

72 - THE NATIONAL ASSEMBLY: 14 March 1957, ESTIMATED EXPENDITURE OF THB ASSEMBLY FOR THE YEAR 1954-55, page 3-11, THE NATIONAL ASSEMBLY: 25 March 1957, THE CENTRAL.BUDGET-LIST OF DEMANDS, page 557، CA (Legislatue) Debates 31 March 1954, page 1074

-73 کارروائی مجلس دستور ساز پاکستان، جلد ۸، شمارہ: ۱، ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۳، ۱۴۔ سرکاری ریکارڈ میں اسی طرح ہے مگر بعد کے حالات اور دینی حلقوں کے رد عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ بورڈ کی سفارشات اس رپورٹ میں مکمل طور پر شامل نہیں کی جاسکیں۔ اس بورڈ کی رپورٹ کو بوجوہ ظاہر بھی نہیں کیا گیا اور بنیادی اصولوں کی پہلی کمیٹی کی سفارشات کو شائع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ احتجاجاً بورڈ سے استعفیٰ دے کر واپس پیرس چلے گئے۔ [تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی، منشی عبدالرحمن خان، ص ۱۷۳]

-74 مجلس دستور ساز پاکستان: Views of the Board of Talimat-e-Islamia on certain items referred to them by the sub-committee on Federal and Provincial constitutions and distribution of powers with annotations, published Army Press Karachi P-1-7-51-300

-75 تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی، منشی عبدالرحمن خان، ص ۱۷۳-۱۷۲، CA Legislatue 23 March 1951, Starred Questions and page 87، Answers, PERSONNEL OF LAW COMMISSION

76- CA Legislature 23 March 1951, Starred Questions and Answers, PERSONNEL OF LAW COMMISSION، page 87

77- CA (Legislature), 25 March 1953, GENERAL BUDGET-LIST OF DEMANDS, DEMAND No.16- MINISTRY OF LAW, page 710-712, 881, CA (Legislature) ,31 March 1952, MISCELLANEOUS, 880

علم سیاست پر کانفرنس (۱۹۵۰ء)

مولوی تمیز الدین خان

مولوی تمیز الدین خان صاحب صدر مجلس دستور ساز اور علامہ علاء الدین صدیقی صدر شعبہ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مل کر ۵- ۷ مارچ ۱۹۵۰ء کو اسلامی دستور کی تدوین کے لیے ایک کل پاکستان علم سیاست کانفرنس (All Pakistan Political Science Conference) منعقد کی۔ اس کانفرنس کی پہلی نشست کا عنوان "اسلامی فلسفۂ حکومت وسیاست" (Muslim doctrine of rule and politics) تھا، جس کی صدارت علامہ محمد اسدؒ نے کی۔[78]

اسلامی اور سماجی تعمیر نو کی سکیمیں

جناب محمد حبیب اللہ بہار

۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو معزز رکن مجلس دستور ساز جناب محمد حبیب اللہ بہار نے عزت مآب وزیر داخلہ سے سوال کیا کہ حکومت نے قیام پاکستان سے اب تک اسلامی اور سماجی تعمیر نو کے سلسلے میں کیا اقدامات کیے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پر اصل کام تو دستور مکمل ہو جانے کے بعد صوبوں کے ساتھ مل کر ہو سکے گا، سر دست جس عارضی دستور کے تحت ہم کام کر رہے ہیں اس کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے درج ذیل اقدامات کیے گئے ہیں:
(۱) ریڈیو پاکستان پر دینی اور اخلاقی موضوعات پر گفتگو کا ایک سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے، (۲) ریڈیو پر تفسیر قرآنِ مجید کا پروگرام روزانہ کی بنیاد پر شروع کر دیا گیا ہے، (۳) کراچی میں بھیک مانگنے کی روک تھام کے لیے قانون بنا دیا گیا ہے اور غرباء کے لیے ایک مرکز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، (۴) کراچی میں طوائف بازاری کی روک تھام کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں، (۵) (۵) رمضان المبارک میں سحری افطاری اور نمازوں کے اوقات میں سہولت کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں، (۶) عید کی نمازوں کے لیے انتظامات کیے گئے ہیں؛ اور عید میلاد کو ایک سرکاری تقریب کے طور پر منانے کا انتظام کیا گیا ہے۔[79]

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے تجویز کردہ نظریاتی ادارے (۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء تا ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء)

مجلس دستور ساز کے تحت قائم ہونے والی بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی تین رپورٹوں میں پاکستان میں اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کے لیے درجِ ذیل اقدامات/اداروں کے قیام کی تجاویز دیں۔[80]

۱۔ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ مسلمان اپنی زندگیاں قرآن وسنت کے مطابق ڈھال سکیں۔
۲۔ وقف اور مساجد کو مناسب طریقے سے چلانے کا نظام تشکیل دیا جائے۔
۳۔ ادارہ اسلامی تعلیمات و امر بالمعروف و نہی عن المنکر
۴۔ ریاستی سطح پر پانچ رکنی علماء بورڈ کا قیام
۵۔ صوبائی سطح پر پانچ رکنی بورڈ کا قیام
۶۔ سپریم کورٹ کے فل بینچ کی تشکیل

78 - ڈاکٹر زاہد منیر عامر بحوالہ All Pakistan Political Science Association Proceedings of the First All Pakistan Political Science Conference 1950 (Lahore: The Punjab University Press, 1950) cf. Muhammad Arshad, p.125

79 - Constituent Assembly; Legislature; Islamic and social Reconstruction Schemes, the 10 April 1951, p.1104

80 - ANNEXURE II کارروائی مجلس دستور ساز پاکستان، جلد ۸، شمارہ ۲۸،۸: ستمبر ۱۹۵۰ء ص ۱۶، Basic Principles Committee، First Report, Basic Principles committee 2nd Report, Basic Principles Committee 3rd Report

۷۔ مالی امور اور مالیاتی معیارات کا کمیشن

۸۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ادارہ

مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (Nucleus Islamic Research Institute) (۱۹۵۴- ۱۹۶۰ء)

۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو مرکزی حکومت کی طرف سے دار لحکومت کراچی میں منعقد ہونے والی "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کی سفارشات میں سے ایک سفارش یہ بھی تھی کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے کے لیے Council of Islamic Studies قائم کی جائے۔ اسی کونسل کا دوسرا نام Islamic Research Institute بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بعد میں مجلس دستور ساز کے مباحث میں اس کا یہی نام لیا جاتا رہا۔ مجلس دستور ساز پاکستان کے اجلاس ۸ مارچ ۱۹۴۸ء میں معزز رکن اسمبلی جناب نور احمد کی طرف سے اس پر عمل درآمد کے بارے میں سوال کیا گیا، جس کے جواب میں وزیر داخلہ جناب فضل الرحمن نے بتایا کہ "ایجوکیشن ڈویژن" نے اس کے قیام کی سکیم تیار کر لی ہے اور اس پر بھرپور توجہ دی جارہی ہے۔[81] مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ ادارہ قائم نہیں ہوسکا، یہاں تک کہ ۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو مجلس دستور ساز پاکستان کے اجلاس میں ظہیر الدین چوہدری معظم حسین (لال میاں) نے تحقیقات اسلامی کے لیے کوئی ادارہ قائم نہ کرنے پر شکوہ کیا۔[82] انہوں نے ایک سال بعد ۱۹ مارچ ۱۹۵۲ء کو پھر اس مسئلے کو اٹھایا اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی قائم کرنے کی تجویز دی۔[83] جناب ظہیر الدین چوہدری معظم حسین (لال میاں) کی طرف سے ہی ۹/اپریل ۱۹۵۲ء اس کے لیے قرارداد پیش کی گئی جو طویل بحث کے بعد منظور ہوئی۔ قرارداد کا مضمون یہ تھا:

اس اسمبلی کی رائے ہے کہ ایک مرکزی ادارہ جس کا نام "ادارہ برائے اسلامی تحقیقات" ہو، کراچی کے وفاقی علاقے میں قائم کیا جائے جس کی مختلف ذیلی شاخیں اور شعبے ہوں جہاں انسانی علم و عمل کے مختلف میدانوں تحقیقات کی جائیں؛ سماجی، معاشی، تاریخی، تعلیمی، ثقافتی، دستوری، عدالتی وغیرہ۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں مختلف موضوعات اور اسلامی مواد پر مشتمل موضوعات پر اعلیٰ درجے کا لٹریچر وہاں سے جاری کیا جائے۔[84]

مگر ادارے کا قیام ۱۹۵۴ء میں جاکر عمل میں آیا۔[85] یہ مرکزی ادارہ ۱۹۵۴ء سے ۱۰ مارچ ۱۹۶۰ء تک قائم رہا، یہاں تک کہ نیا ادارہ قائم کرکے پہلے ادارے کو اسی میں ضم کردیا گیا۔ مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی روز اول سے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے افسر انچارج رہے اور بعد میں وہی اس کے ڈائریکٹر بنے۔ اس ادارے کی تشکیل نو کے کئی ادوار ہوئے اور اس وقت وہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا حصہ ہے۔ اس عرصے میں اس نے اپنے فرائضِ منصبی بھرپور طریقے سے ادا کیے، جنہیں اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو میں اہم مقام حاصل ہے۔

انٹر نیشنل اسلامک کلوکیم

دستور ۱۹۵۶ نافذ ہوجانے کے بعد ملک میں عملی طور پر اسلامی ریاست کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس (International Islamic Colloquium) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس مقصد کے لیے پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی نے ۹ فروری ۱۹۵۷ء کو اس کانفرنس کے لیے ۵ لاکھ پچاس ہزار روپے مختص کیے[86]۔ اس اجتماع کے انعقاد میں پنجاب یونیورسٹی کو وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان اور وزارت خارجہ امور و کامن ویلتھ کو اپریشن کا تعاون حاصل رہا۔[87] کانفرنس کے موضوعات درجِ ذیل رکھے گئے:

81- Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 8 March 1948, 315- 316

82- Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 24 March 1951, p.260

83- Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 19 March 1952, p.252

84- Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 9 April 1952, p.252

85- CONSTITUENT ASSEMBLY: 26 March 1954, THE CENTRAL. BUDGET-LIST OF DEMANDS, page 624, National Assembly of Pakistan Debates, 23 August 1957, Starred Questions and answers, page 190 -110

86- THE NATIONAL ASSEMBLY PARLIAMENTARY OF PAKISTAN DEBATES Volume 1-1957, *Saturday, the 9th February, 1957,* FINANCIAL YEAR 1957-58, EXPENDITURE, page 13

87- خیر مقدمی خطاب، وائس چانسلر، پروفیسر محمد افضل حسین International Islamic Colloquium Papers (December 29,1957- January 8,1958), Lahore, Pakistan, at the Punjab University Press, 1960 P-1

۱۔ اسلامی تہذیب: ہماری اس سے کیا مراد ہے؟

۲۔ اسلام کا تصورِ ریاست

۳۔ مسلم معاشرے کو جدید نظریات اور معاشرتی اقدار کا چیلنج

۴۔ اسلام میں اجتہاد کا کردار اور قانون سازی کی گنجائش

۵۔ جدید سائنس کی نسبت اسلام کا رویہ

۶۔ مغربی تاریخ و ثقافت پر اسلام کے اثرات

۷۔ اسلام کے معاشرتی ڈھانچے میں معاشیات کا مقام؛ غیر منقولہ زمینی جائداد اور ملکیت زمین پر خصوصی توجہ کے ساتھ

۸۔ اسلام کا دیگر مذاہب کے بارے میں رویہ اور اس کا ان کے ساتھ تعلق

۹۔ دنیا کے امن و امان میں اسلام کے کردار کی بنیادی صلاحیت [88]

یہ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس لاہور میں اپنے مقررہ وقت پر ۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء تا ۸ جنوری ۱۹۵۸ء منعقد ہوئی جس میں ۴۰ ممالک کے ممتاز اہلِ علم و دانش نے مقالہ جات پیش کئے۔ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، شیخ احمد جمال، مولانا مودودی، پروفیسر محمد ابو زہرہ، علامہ رشید ترابی، مصطفیٰ احمد زرقاء، ڈاکٹر حسن المعصومی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، غلام احمد پرویز جیسے نامور محققین شامل تھے۔ اس کے علاوہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئی اس کانفرنس میں جن اہم موضوعات پر مقالہ جات پیش کئے گئے ان میں اسلامی تہذیب، ریاست کا اسلامی تصور، اسلام میں اجتہاد اور قانون سازی، سائنس کے بارے میں اسلام کا موقف، دیگر مذاہب کے بارے میں اسلام کا رویہ شامل تھے۔ [89]

دستور ۱۹۵۶ء کے تحت قائم ہونے والے نظریاتی ادارے

دستور پاکستان ۱۹۵۶ء میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا اور قراردادِ مقاصد کو آئین کی تمہید کا حصہ بنایا گیا، آئین کے اندر قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا یقین دلایا گیا اور اس کام کے لیے درجِ ذیل دو اہم ادارے قائم کیے گئے:

۱۔ ادارہ تحقیق و تدریسِ اسلامی۔ آرٹیکل ۱۹۷ (۱) (۲) "مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا تھا۔ پاکستان کے پہلے دستور ۱۹۵۶ء کے تحت جو ادارہ تحقیق و تدریس اسلامی کے قیام کا جو تقاضا کیا گیا تھا، اس کا بروقت قیام عمل میں نہ لایا جاسکا، البتہ اس ادارے کا کام پہلے سے قائم "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی" کرتا رہا، پھر چلتے چلتے ۱۹۶۰ء میں اس کے نام کے انگریزی الفاظ میں معمولی تبدیلی کر کے Neuclus Islamic Research Institute کی جگہ Central Islamic Research Institute کر دیا گیا اور دوبارہ "مرکزی تحقیقاتِ اسلامی" کے نام سے ہی ادارہ قائم کر کے پہلے ادارے کو اس میں ضم کر دیا گیا۔

۲۔ آئین ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۱۹۸ (۱)، (۲)، (۳) کے تحت دوسرا ادارہ اِسلامی کمیشن (۱۹۵۷-۱۹۵۸ء) کے نام سے قائم ہونا تھا۔ اس کی تشکیل ایک نوٹیفکیشن مؤرخہ ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء کے ذریعے عمل میں لائی گئی۔ کمیشن کے فرائضِ منصبی درجِ ذیل تھے:

اَ۔ سفارشات پیش کرنا—

(i) موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے طریقوں کی، اور

(ii) ایسے مراحل کی جن سے گزر کر ان طریقوں کو مؤثر بنانا چاہیے؛ اور

ب۔ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی راہنمائی کے لیے ایسے اسلامی احکام کی ایسے طریقے سے تدوین کرنا کہ انہیں قانون کے طور پر مؤثر بنایا جاسکے۔

کمیشن اپنی حتمی رپورٹ اپنے قیام سے پانچ سال کے عرصے میں پیش کرے گا، البتہ وہ اپنی کوئی عبوری رپورٹ اس سے قبل بھی پیش کر سکتا ہے۔ رپورٹ عبوری ہو یا حتمی اسے اس کی وصولی کے چھ ماہ کے اندر اندر قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اسمبلی اس رپورٹ پر غور و خوض کے بعد اس کے بارے میں قانون سازی کرے گی۔ [90]

88- ڈاکٹر زاہد منیر عامر بحوالہ Alauddin Siddiqui, Foreword International Islamic Colloquium Papers December 29, 1957–January8, 1958, Lahore: Punjab University Press, 1960, p. VII

89- کانفرنس میں پیش کئے گئے مقالہ جات کی مطبوعہ کاپی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دستیاب ہے۔

90- اعلامیہ نمبر F.19 (1) / 56 Ref.dated the 22nd March 1957، محفوظ قومی اسمبلی لائبریری، اسلام آباد، پاکستان۔

پھر ۱۱ اگست ۱۹۵۷ء کو ایک اور نوٹی فکیشن کے ذریعے اس کے دَس ارکان کا تقرر کیا گیا، فاضل ارکان کے اسماءِ گرامی درجِ ذیل ہیں:

۱-	مولانا ظفر احمد عثمانی	۶-	ڈاکٹر سید اعجاز حسین جعفری
۲-	مولانا کفایت حسین	۷-	مسٹر غلام احمد پرویز
۳-	مولانا غلام مرشد	۸-	مولانا راغب احسن
۴-	مولانا اکرم خان	۹-	علامہ آئی آئی قاضی
۵-	مولانا امین احسن اصلاحی	۱۰-	مسٹر اے کے بروہی

یہ آئین کچھ زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

دستور ۱۹۶۲ء کے تحت قائم ہونے والے ادارے

قرار دادِ مقاصد کو حسبِ سابق آئین کی تمہید میں شامل کیا گیا اور قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے اسمبلی میں بہت بحثیں ہوئیں، جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ نظریاتی مباحث میں ایسی ایسی شخصیات نے مؤثر طور پر حصہ لیا جنہیں عام طور پر لبرل سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۱ جولائی ۱۹۶۲ء بروز بدھ سیاسی جماعتوں کے بل پر بحث کرتے ہوئے جب یہ سوال آیا کہ جو جماعتیں پاکستانی علاقوں کے ربط باہمی اور امن وامان کے خلاف منشور رکھتی ہوں انہیں رجسٹریشن کی اجازت نہ دی جائے تو بہت سے ارکان اسمبلی نے ایسی جماعتوں کو بھی رجسٹریشن کی اجازت نہ دینے کی تجویز دی جو نظریہ پاکستان کے خلاف منشور رکھتی ہو۔ اس موقع پر لمبی بحث اور جاندار خطابات ہوئے۔ ان جاندار تقاریر میں سے ایک اس وقت کے وزیر بجلی ذوالفقار علی بھٹو کی بھی تھی۔ ان کی تقریر کے آخری جملے یہ تھے:

> If there is a challange to our ideology, we will prove the supriority of our ideology,we are proud to be Muslims. We will die for our religion, and we will die for our ideoloy .[91]

"اگر ہمارے نظریے کو کوئی خطرہ ہو گا تو ہم اپنے نظریے کی برتری ثابت کر دیں گے، ہمیں مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ ہم اپنے مذہب کے لیے جان دے دیں گے اور ہم اپنے نظریے کے لیے جان دے دیں گے۔"

اسی دستور ۱۹۶۲ء کے تحت درجِ ذیل دو اہم ادارے قائم کیے گئے:

اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل

اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل دستورِ پاکستان ۱۹۶۲ء کے حصہ دہم، اسلامی ادارے، باب ا۔ اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کی دفعات ۱۹۹ تا ۲۰۶ کے تحت وجود میں آئی۔ ان دفعات کے تحت اس کی تشکیل اور معاشرے کی تعمیر نو کے لیے اس کے فرائضِ منصبی درجِ ذیل ہیں:

۱۹۹۔ اسلامی نظریہ کی ایک مشاورتی کونسل ہو گی۔

۲۰۰۔ مذکورہ کونسل ارکان کی اتنی تعداد پر مشتمل ہو گی جو پانچ سے کم اور بارہ سے زائد نہ ہو گی، جیسا کہ صدر ان کا تعین کریں۔

۲۰۱۔ (۱) کونسل کے اراکین کا تقرر صدر ایسی شرائط وضوابط کے مطابق کرے گا جو وہ خود طے کرے۔

(۲) صدر کونسل میں تقرر کے لیے کسی شخص کا انتخاب کرتے وقت اس شخص کے اسلام کے فہم وادراک اور پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کی سمجھ بوجھ کا لحاظ رکھے گا۔

۲۰۲۔ (۱) کونسل کا کوئی رکن اپنے تقرر کی تاریخ سے تین سال کی مدت کے لیے اپنے عہدے پر فائز رہے گا۔

(۲) اگر کونسل کے کسی رکن کی اس کے عہدے سے برطرفی پر مبنی سفارش کی کوئی قرارداد کونسل کے کل ارکان کی اکثریت سے منظور ہو جائے تو صدر اس رکن کو اس کے عہدے سے برطرف کر سکتا ہے مگر کسی رکن کو عہدے سے بصورت دیگر برطرف نہیں کیا جائے گا۔

(۳) کونسل کا کوئی رکن صدر کے نام اپنی دستخطی تحریر کے ذریعے اپنے عہدے سے مستعفی ہو سکے گا۔

۲۰۳۔ صدر کونسل کے ارکان میں سے ایک کو اس کا چیئر مین مقرر کرے گا۔

91- National Assembly, 11 July 1962;The Political Parties Bill, page: 1354

کونسل کا منشور

۲۰۴- (۱) کونسل کے کارہائے منصبی درج ذیل ہوں گے :-

(الف) مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو ایسی سفارشات کرنا جن کے ذریعے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں ہر لحاظ سے اسلامی نظریات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنایا جاسکے، نیز اس کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جاسکے اور دستور کی پہلی ترمیم کے ایکٹ ۱۹۶۳ء کے نفاذ سے فوراً پہلے نافذ العمل تمام قوانین کا جائزہ لینا تا کہ انہیں قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جائے) ؛اور

(ب) قومی اسمبلی، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کو کسی ایسے سوال کے بارے میں مشورہ دینا جو کونسل کو آرٹیکل ۸ کے تحت ارسال کیا گیا ہو کہ آیا کوئی مجوزہ قانون ان اسلامی تعلیمات اور مقتضیات کے منافی ہے یا نہیں جو قرآن وسنت میں منضبط ہیں۔

(۲) جب آرٹیکل ۸ کے تحت کوئی سوال اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کی طرف سے کونسل کو مشورہ دینے کے لیے بھیجا جائے تو کونسل اس کے بعد سات دنوں کے اندر اس اسمبلی، صدر یا گورنر کو، جیسی بھی صورت ہو، اس مدت کے بارے میں مطلع کرے گی جس کے اندر وہ مذکورہ مشورہ فراہم کرنے کی توقع رکھتی ہو۔

(۳) جب صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر، جیسی بھی صورت ہو، یہ خیال کرے کہ مفاد عامہ کی خاطر اس مجوزہ قانون کا وضع کرنا جس کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا مشورہ حاصل ہونے تک ملتوی نہ کیا جائے، تو اس صورت میں مذکورہ قانون مشورہ مہیا ہونے سے قبل وضع کیا جاسکے گا۔

قواعد ضابطہ کار

۲۰۵- (۱) کونسل کی کارروائی ایسے قواعد ضابطہ کار کے ذریعے منضبط کی جائے گی جو کونسل صدر کی منظوری سے وضع کرے۔

(۲) کونسل ہر سال پندرہ جنوری سے پہلے پہلے سال کے دوران جس کا اختتام گزشتہ اکتیس دسمبر کو ہوا، اپنی کارروائیوں کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرے گی اور اسے صدر کو پیش کرے گی جو اسے قومی اسمبلی کے سامنے (برائے غور) پیش کرے گا۔

۲۰۶- باب ہذا میں "کونسل" سے مراد اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل ہے۔[92]

کارکردگی کا خلاصہ

۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت قائم شدہ کونسل نے ۱۹۷۲ء تک مجموعہ قوانین پاکستان (Pakistan Code) کی سولہ جلدوں میں منضبط تقریباً چار ہزار قوانین میں سے تقریباً دو سو (۲۰۰) قوانین پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور وخوض کر کے ان کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات پیش کیں، جن میں سے چند اہم قوانین؛ قانونِ غلامی (The Slavery Act 1843)، قمار بازی ایکٹ (The Gambling Act)، قانونِ طلاق (The Divorce Act 1869)، قانونِ ازدواجِ نصاریٰ (The Christian Marriage Act 1872)، قانونِ حلف (The Oath Act 1873)، قانونِ شہادت (The Evidence Act 1872)، قانونِ جوازِ ازدواج (The Marriage Validation Act 1872)، قانونِ احکامِ عامہ (The General Clauses Act 1882)، قانونِ گارڈن اینڈ وارڈ (The Guardian and Ward Act 1890)، قانونِ جزامیان (The Lepers Act 1898) اور تعزیراتِ پاکستان کی بعض دفعات قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح کونسل نے دستور ۱۹۶۲ء کے آرٹیکل ۲۰۴ کی ذیلی دفعہ 'ب' کے تحت حکومت کی طرف سے کیے جانے والے ۱۱۹ استفسارات کا جواب دیا اور معاشرے کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے سلسلے میں حکومت کو ۲۴ سفارشات پیش کیں، جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں: مسلم عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء، مسئلۂ ربا، سرکاری وعام تقریبات میں مُسکر اشیاء کے استعمال پر پابندی، ماہِ رمضان میں روزے کے اوقات کے دوران کھانے پینے کی تقریبات کے اہتمام کی ممانعت، فلم سنسر بورڈوں میں پختہ ذہن اور اعلیٰ کردار کے حامل اشخاص کا تقرر، اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کی روک تھام، نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ تعلیمی پالیسی کی ترتیب، نصاب قانون کی تدوینِ نو، کے۔جی۔ کے درجے سے گریجویشن کے درجے تک اسلامیات کی لازمی تعلیم اور تنظیم زکوٰۃ وغیرہ۔[93]

92- منقول شدہ از ۱۹۶۵ء، Notification NOTIFICATION No. F. 24 (23) /65-A، Government of Pakistan، Ministry of Law and Parliamentary Affairs، (Law Division)، Rawalpinid, the 20th July, 1965.

93- اسلامی نظریاتی کونسل، سالانہ رپورٹ ۱۹۷۷-۷۸ء، ص ۴-۵

اسی دستور کے آرٹیکل ۲۰۷ کے تحت ادارۂ تحقیقات اسلامی کی تشکیل نو بھی کی گئی جو عملاً ۱۹۶۵ء میں ہو سکی۔ اس سے قبل پہلا ادارہ اپنے پرانے نام "مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کے ساتھ ہی کام کرتا رہا۔

اقبال اکیڈمی

اقبال اکیڈمی: یہ آئینی ادارہ تو نہیں مگر آئین ساز اسمبلی کا تخلیق کردہ ضرور ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو بجٹ میں ایک لاکھ روپے "اقبال یادگاری فنڈ" کے لیے مختص کیے گئے۔[94] ۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو وزیر مالیات جناب غلام محمد نے اقبال اکیڈمی قائم کرنے کے لیے قرارداد پیش کی جو کہ منظور کرلی گئی۔[95] اقبال اکادمی کا قیام "اقبال اکادمی آرڈی نینس ۱۹۶۲ء" کے تحت بطور مرکزِ فضیلت برائے اقبال شناسی عمل میں آیا۔ اکادمی کے سرپرستِ اعلیٰ صدرِ پاکستان ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ایک سرپرست، ایک صدر، ایک نائب صدر، کچھ اعزازی اراکین، کچھ تاحیات اراکین اور کچھ صرف اراکین ہوتے ہیں۔ اکادمی کا صدر اس کی ہیئتِ حاکمہ کا صدر نشین ہوتا ہے اور ناظم مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد بھی اس کی ہیئت حاکمہ میں شامل ہے۔[96]

اقبال اکیڈمی لاہور کا ایک منظر

دستور ۱۹۷۳ء کے تحت اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار ملنے کے بعد پارلیمانی جماعتوں کے قائدین کو اپنے ساتھ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ایک اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس اجلاس میں تفصیلی بحث مباحثے کے نتیجے میں ایک معاہدہ وجود میں آیا جو "دستوری معاہدہ" (constitutional accord) کے نام سے مشہور ہوا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی تجویز پر قومی اسمبلی نے ۱۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو پاکستان کے ایک مستقل دستور کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جناب محمود علی قصوری اس کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی میں شامل تمام پارلیمانی گروپوں کے قائدین نے دستوری بل کے مسودے پر دستخط کیے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایک دستور مہیا کرنے کے لیے ایک بل ۲ فروری ۱۹۷۳ء کو اسمبلی میں متعارف کرایا گیا۔ اسمبلی نے تقریباً مکمل اتفاق رائے سے یہ بل ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو پاس کر لیا اور ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو اس وقت کے قائم مقام صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اس کی تصدیق کر دی۔ ۱۴/اگست ۱۹۷۳ء کو یہ دستور مؤثر ہو گیا۔ اسی دِن بھٹو صاحب نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف اٹھالیا اور چوہدری فضل الٰہی صدر مملکت بن گئے۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء کو ایک متفقہ اسلامی جمہوری دستور قرار دیا گیا جو بذاتِ خود پاکستانی معاشرے کی اسلامی تعمیر نو کے سلسلے میں ایک اہم اقدام شمار ہوتا ہے۔ اس دستور کی اسلامی دفعات پر [مع بعد کی ترمیمات] ایک طائرانہ نظریوں ڈالی جاسکتی ہے:

94 - Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 1st March 1948, p.64- 65

95 - Constituent Assembly; Legislature, Monday, the 8 March 1948, p.364-365

96 - http://www.iap.gov.pk/ur/index.html

آئین کے آرٹیکل ۱ کے مطابق ملک کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہے۔ آرٹیکل ۲ کے مطابق اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ آرٹیکل ۲ (اے) کے تحت قرارداد مقاصد کو آئین کا اہم ترین حصہ بنایا گیا ہے [جنرل ضیاء الحق کے عہد میں ترمیم]۔ یہی قرارداد مقاصد آئین کے ابتدائیہ میں شامل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور یہ بھی عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق، جس طرح قرآن اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔

آئین کے آرٹیکل ۳۱ کا تعلق "اسلامی طریق زندگی" کے متعلق ہے۔ اس میں اسلامی طرز زندگی کے متعلق بتایا گیا ہے۔ (ا) پاکستان کے مسلمانوں کو، انفرادی اور اجتماعی طور پر، اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لیے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔ (۲) پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں مملکت مندرجہ ذیل کے لیے کوشش کرے گی: (الف) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینا، عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لیے سہولت بہم پہنچانا اور قرآن پاک کی صحیح اور من وعن طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرنا؛ (ب) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں کی پابندی کو فروغ دینا اور (ج) زکوٰۃ [عشر] اوقاف اور مساجد کی باقاعدہ تنظیم کا اہتمام کرنا۔ آرٹیکل ۳۷ (ز) میں وعدہ کیا گیا ہے کہ سماجی سطح پر انصاف فراہم کیا جائے گا اور معاشرے سے برائیاں ختم کی جائیں گی اور عصمت فروشی، قمار بازی، ضرر رساں ادویات کے استعمال، فحش ادب اور اشتہارات کی طباعت، نشر واشاعت کی روک تھام کی جائے گی۔ آرٹیکل ۳۷ (ح) میں کہا گیا ہے کہ نشہ آور مشروبات کے استعمال کی، سوائے اس کے کہ وہ طبی اغراض کے لیے یا غیر مسلموں کی صورت میں مذہبی اغراض کے لیے ہو، روک تھام کرے گی۔ آرٹیکل ۳۸ (و) میں لکھا ہے کہ ربا کو جتنی جلد ممکن ہو ریاست اسے ختم کرے گی۔ آرٹیکل ۴۲ (ب) میں کہا گیا ہے کہ ملک کا صدر مسلمان ہوگا۔ آرٹیکل ۶۲ میں سینیٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان اور صوبائی اسمبلی کے ارکان کے طور پر منتخب ہونے کیلیے شرائط بتائی گئی ہیں۔ ۶۲ (د) میں بتایا گیا ہے کہ ایسا شخص اچھے کردار کا حامل ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف کے لیے مشہور نہ ہو۔ (ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو۔ (و) وہ سمجھدار اور پارسا ہو اور فاسق نہ ہو اور ایماندار اور امین ہو، کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہو، اس نے قیام پاکستان کے بعد ملک کی سالمیت کے خلاف کام نہ کیا ہو یا نظریہ پاکستان کی مخالفت نہ کی ہو۔

آرٹیکل ۹۱ (۳) میں لکھا ہے کہ وزیر اعظم کو قومی اسمبلی کا مسلم رکن ہونا چاہئے۔ آرٹیکل ۲۰۳ (۳) میں وفاقی شریعت کورٹ کے قیام کی بات کی گئی ہے۔ آرٹیکل ۲۲۷ میں یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت کے منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔ آرٹیکل ۲۲۸ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کی بات کی گئی ہے جس کا کام موجودہ قوانین میں تبدیلی لا کر انہیں اسلامی بنانا ہوگا اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا ہوگا جن سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصوارت کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے۔

آرٹیکل ۲۶۰ (۳) اے میں بتایا گیا ہے کہ "مسلم" سے مراد کوئی ایسا شخص جو وحدت اور توحید قادر مطلق اللہ تبارک وتعالیٰ، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہو اور پیغمبر یا مذہبی مصلح کے طور پر کسی ایسے شخص پر نہ ایمان رکھتا ہو نہ اسے مانتا ہو جس نے حضرت محمد ﷺ کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہو یا جو دعویٰ کرے۔ ۲۶۰ (ب) میں قادیانی اور لاہوری گروپ یا پھر کوئی بھی ایسا گروپ جو خود کو احمدی کہلواتا ہے، اسے غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔

جدول سوم میں صدر مملکت اور وزیر اعظم کے عہدوں کا حلف پیش کیا گیا ہے جس کے تحت وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور وہ توحید قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ، کتب الٰہیہ، جن میں قرآن پاک خاتم الکتب ہے، نبوت حضرت محمد ﷺ بحیثیت خاتم النبیین، جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، روز قیامت اور قرآن پاک و سنت کی جملہ تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وفاقی وزراء، وزرائے مملکت، ارکان پارلیمنٹ، چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینیٹ، اسپیکر و ڈپٹی اسپیکر قومی اسمبلی، گورنر صاحبان، وزرائے اعلیٰ صاحبان اور صوبائی ارکان کابینہ بشمول غیر مسلم پر لازم ہے کہ وہ حلف اٹھائیں کہ وہ اسلامی نظریات کے تحفظ کے لیے کام کریں گے جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے۔ اس میں یہ بھی وعدہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی اتحاد کے فروغ کے لیے مسلم دنیا کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنایا جائے گا۔ آئین میں یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ اقلیتوں کے لیے مناسب قانون سازی کی جائے گی تاکہ وہ اپنے مذاہب پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

عملی اقدامات

عبوری دستور ۱۹۷۲ءاور مستقل دستور ۱۹۷۳ء کے ابتدائی زمانے میں حکومت کی طرف سے معاشرے کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر نو کے لیے کئی عملی اقدامات کیے گئے۔ قومی اسمبلی کے مباحث میں تسلسل کے ساتھ "اسلام"، "نظریۂ پاکستان"، "مذہب" اور "اسلامی ریاست" وغیرہ پر سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ یہاں سب کی تفصیل دینا تو ممکن نہیں، مثال کے طور پر چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں اور تفصیل کے لیے ان سے متعلقہ بحث قومی اسمبلی دیکھی جاسکتی ہے۔ تمام صوبوں کے دینی مدارس کو مالی امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۷۲- ۱۹۷۱ء کے مالی سال میں مدارس کو دی جانے والی امداد اور ان مدارس کی فہرست قومی اسمبلی کے وقفہ سوالات بروز پیر ۸ جنوری ۱۹۷۳ء میں پیش کی گئی۔ ایم اے کی سطح پر بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو وظائف دیے جاتے تھے ان میں اسلامیات کے طلبہ کو بھی شامل کیا گیا۔[97] سکولوں میں عربی اور قرآن مجید کی تعلیم کی سہولت مہیا کی گئی، اس میں مدارس کے فضلاء کو بطور مدرس مقرر کیا گیا اور جدید عربی سکھانے کے لیے عرب ممالک سے خصوصی امداد کا انتظام کیا گیا۔ دونوں ملکوں میں معاہدے کے تحت مصر کے اساتذہ مختلف پاکستانی اداروں میں آکر عربی کی تعلیم دیتے رہے۔ لیبیا کے ساتھ پاکستان میں ایک اسلامی سنٹر اور ایک پبلیشنگ ہاؤس قائم کرنے کا معاہدہ کیا گیا۔[98] اسی دور میں ریڈیو پر تلاوت قرآنِ مجید، قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی، روشنی اور سرچشمہ ہدایت جیسے پروگرام شروع ہوئے۔ رمضان المبارک اور محرم میں خصوصی دینی پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا تھا، عربی کے اسباق نشر کیے جاتے تھے اور چار صوبائی قومیتوں کی بجائے دو قومی نظریے کا پرچار کیا جاتا تھا۔ اور ٹیلی ویژن پر بھی اس طرح کے پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔[99] لاہور میں عالمی اسلامی کانفرنس ہوئی جس کے بعد مسلم ممالک کے آپس میں تعلقات کو ایک نیا رخ ملا اور ان کے درمیان ایک نیا ربط پیدا ہوا۔[100] میٹرک تک اسلامیات کا مضمون لازمی تھا اور میٹرک کے بعد بطور اختیاری مضمون اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔[101] ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی کارکردگی پر اسمبلی میں بحث کی جاتی تھی۔ اس دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے باقاعدہ ایک خاکہ ترتیب دے کر اسلام کا معاشرتی نظام ترتیب دینا شروع کر دیا تھا۔[102] وفاق المدارس کی سند کو ایم اے اسلامیات کے برابر قرار دینے کی قرار داد اسمبلی میں اسی دور میں پیش ہوئی، اس پر خوب بحث بھی ہوئی مگر بے نتیجہ رہی۔ جمعہ کی چھٹی اسی دور میں ہوئی اور اس کے علاوہ کئی اقدامات ہوئے۔

اسلامی نظریاتی کونسل / اِسلامی کونسل متعلقہ دفعات

دستور پاکستان ۱۹۷۳ء کے باب باب نہم: اسلامی احکام میں اسلامی نظریاتی کونسل کی ضرورت، تشکیل، طریق کار اور فرائضِ منصبی کی تفصیل موجود ہے۔ جس میں قانون کی اسلامی تشکیل اور معاشرے میں فرد اور معاشرے کی سطح پر زندگی کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر نو کا تقاضا وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ دفعہ وار تفصیل درجِ ذیل ہے:

۲۲۷- (۱) تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں مُنضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے، اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

[تشریح:- کسی مسلمان فرقے کے قانون شخصی پر اس شق کا اطلاق کرتے ہوئے، عبارت "قرآن وسنت" سے مذکورہ فرقے کی کی ہوئی توضیح کے مطابق قرآن اور سنت مراد ہو گی]۔[103]

(۲) شق (۱) کے احکام کو صرف اس طریقہ کے مطابق نافذ کیا جائے گا جو اس حصہ میں منضبط ہے۔

(۳) اس حصہ میں کسی امر کا غیر مسلم شہریوں کے قوانین شخصی یا شہریوں کے بطور ان کی حیثیت پر اثر نہیں پڑے گا۔

۲۲۸- (۱) یوم آغاز سے نوے دن کی مدت کے اندر اسلامی نظریاتی کونسل[104] تشکیل دی جائے گی جس کا اس حصے میں بطور اسلامی کونسل حوالہ دیا گیا ہے۔

97 - National Assembly, Legislature, 8 January 1973, page: 492

98 - National Assembly, Legislature, 3 June 1975, page: 492

99 - National Assembly, Legislature, 23 June 1975,General Budget Discussion, page: 86- 87

100 - National Assembly, Legislature, 23 June 1975,General Budget Discussion, page: 189

101 - National Assembly, Legislature, 23 June 1975,Starred Questions and Answers, page: 227

102 - National Assembly, Legislature, 10 April 1975, page:426- 427

103- فرمان دستور (ترمیم سوم) ۱۹۸۰ء (فرمان صدر نمبر ۱۴ مجریہ ۱۹۸۰ء) کے آرٹیکل ۲ کی روسے تشریح کا اضافہ کیا گیا۔

104- اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے اعلان کے لیے دیکھئے جریدہ پاکستان، ۱۹۷۴ء غیر معمولی، حصہ دوم، صفحہ ۱۶۵۔ (قواعد و شرائط ارکان) اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۹۷۴ء کے لیے دیکھئے جریدہ پاکستان، ۱۹۷۴ء غیر معمولی، حصہ دوم، صفحہ ۱۷۲۷

(۲) اسلامی کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ[105][بیس] ایسے ارکان پر مشتمل ہوگی جنہیں صدر ان اشخاص میں سے مقرر کرے، جو اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا، جس طرح کہ قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، علم رکھتے ہوں، یا جنہیں پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم وادراک ہو۔

(۳) اسلامی کونسل کے ارکان مقرر کرتے وقت صدر ان امور کا تعین کرے گا کہ

(الف) جہاں تک قابل عمل ہو کونسل میں مختلف مکاتب فکر کو نمائندگی حاصل ہو؛

(ب) کم از کم دو ارکان ایسے اشخاص ہوں جن میں سے ہر ایک عدالت عظمیٰ یا کسی عدالت عالیہ کا جج ہو یا رہا ہو؛

(ج) کم از کم[106][ایک تہائی] ارکان ایسے ہوں جن میں سے ہر ایک کم سے کم پندرہ سال کی مدت سے اسلامی تحقیق یا تدریس کے کام سے وابستہ چلا آرہا ہو؛اور

(د) کم از کم ایک رکن خاتون ہو۔

[(۴) صدر اسلامی کونسل کے ارکان میں سے ایک کو اس کا چیئرمین مقرر کرے گا]۔[107]

(۵) شق (۶) کے تابع، اسلامی کونسل کا کوئی رکن تین سال کی مدت کے لیے اپنے عہدے پر فائز رہے گا۔

(۶) کونسل کا کوئی رکن صدر کے نام اپنی دستخطی تحریر کے ذریعے اپنے عہدے سے مستعفی ہو سکے گا، یا اگر اسلامی کونسل کے کل ارکان کی اکثریت سے ایک قرارداد کونسل کے کسی رکن کی برطرفی سے متعلق منظور ہو جائے تو صدر اس رکن کو برطرف کر سکے گا۔

۲۲۹- صدر یا کسی صوبے کا گورنر، اگر چاہے یا اگر کسی ایوان یا کسی صوبائی اسمبلی کی کل رکنیت کا دو بٹا پانچ حصہ یہ مطالبہ کرے، تو کسی سوال پر اسلامی کونسل سے مشورہ کیا جائے گا کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلام کے احکام کے منافی ہے یا نہیں۔

۲۳۰- (۱) اسلامی کونسل کے کارہائے منصبی حسب ذیل ہوں گے:

(الف) [108][مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)] اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا جن سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب اور معاونت ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے؛

(ب) کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کو کسی ایسے سوال کے بارے میں مشورہ دینا جس میں کونسل سے اس بابت رجوع کیا گیا ہو کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے یا نہیں؛

(ج) ایسی تدابیر کی جن سے نافذ العمل قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، نیز ان مراحل کی جن سے گزر کر محولہ تدابیر کا نفاذ عمل میں لانا چاہیے، سفارش کرنا؛اور

(د) [109][مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)] اور صوبائی اسمبلیوں کی راہنمائی کے لیے اسلام کے ایسے احکام کی ایک موزوں شکل میں تدوین کرنا جنہیں قانونی طور پر نافذ کیا جا سکے۔

(۲) جب 'آرٹیکل ۲۲۹ کے تحت' کوئی سوال کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کی طرف سے اسلامی کونسل کو بھیجا جائے، تو کونسل اس کے بعد پندرہ دن کے اندر اس ایوان، اسمبلی، صدر یا گورنر کو، جیسی بھی صورت ہو، اس مدت سے مطلع کرے گی جس کے اندر وہ مذکورہ مشورہ فراہم کرنے کی توقع رکھتی ہو۔

(۳) جب کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر، جیسی بھی صورت ہو، یہ خیال کرے کہ مفادِ عامہ کی خاطر اس مجوزہ قانون کا وضع کرنا جس کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا مشورہ حاصل ہونے تک ملتوی نہ کیا جائے، تو اس صورت میں مذکورہ قانون مشورہ مہیا ہونے سے قبل وضع کیا جا سکے گا:

مگر شرط یہ ہے کہ جب کوئی قانون اسلامی کونسل کے پاس مشورے کے لیے بھیجا جائے اور کونسل یہ مشورہ دے کہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے تو ایوان، یا جیسی بھی صورت ہو، صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر اس طرح وضع کردہ قانون پر دوبارہ غور کرے گا۔

105- فرمان دستور (ترمیم چہارم) ۱۹۸۰ء (فرمان صدر نمبر ۱۶ مجریہ ۱۹۸۰ء) کے آرٹیکل ۲ کی رو سے "پندرہ" کی بجائے تبدیل کیا گیا۔

106- دستور (اٹھارویں ترمیم) ایکٹ، ۲۰۱۰ (نمبر ۱۰ بابت ۲۰۱۰ء) کی رو سے "چار" کی بجائے تبدیل کیا گیا۔

107- فرمان دستور (ترمیم سوم) ۱۹۸۲ء (فرمان صدر نمبر ۱۳ مجریہ ۱۹۸۲ء) کے آرٹیکل ۲ کی رو سے شق (۴) کی بجائے تبدیل کی گئی۔

108- احیائے دستور ۱۹۷۳ء کا فرمان، ۱۹۸۵ء (فرمان صدر نمبر ۱۴ مجریہ ۱۹۸۵ء) کے آرٹیکل ۲ اور جدول کی رو سے "پارلیمنٹ" کی بجائے تبدیل کئے گئے۔

109- احیائے دستور ۱۹۷۳ء کا فرمان، ۱۹۸۵ء (فرمان صدر نمبر ۱۴ مجریہ ۱۹۸۵ء) کے آرٹیکل ۲ اور جدول کی رو سے "پارلیمنٹ" کی بجائے تبدیل کئے گئے۔

(۴) اسلامی کونسل اپنے تقرر سے سات سال کے اندر اپنی حتمی رپورٹ پیش کرے گی، اور سالانہ عبوری رپورٹ پیش کیا کرے گی، یہ رپورٹ، خواہ عبوری ہو یا حتمی، موصولی سے چھ ماہ کے اندر دونوں ایوانوں اور ہر صوبائی اسمبلی کے سامنے برائے بحث پیش کی جائے گی، اور[110] [مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)] اور اسمبلی، رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد حتمی رپورٹ کے بعد دو سال کی مدت کے اندر اس کی نسبت قوانین وضع کرے گی۔

۲۳۱۔ اسلامی کونسل کی کارروائی ایسے[111] قواعد ضابطہ کار کے ذریعے منضبط کی جائے گی جو کہ کونسل صدر کی منظوری سے وضع کرے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اول اور کارکردگی

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پانچویں صدر جناب فضل الٰہی چوہدری اور نویں وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت کے اوائل میں نئے دستور پاکستان ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۲۸ کے تحت بذریعہ نوٹیفکیشن نمبر ایف (۲) ۷۳۔اے آئی آئی ۲ فروری ۱۹۷۴ء کو مندرجۂ ذیل ۱۳ اراکین (بشمول چیئرمین) پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل کی پہلی تشکیل ہوئی[112]:

اس کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس حمود الرحمن (چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان) بنے اور معزز ارکان میں جناب جسٹس قاضی محمد گل (جج سپریم کورٹ، سیکرٹری وزارت قانون)، جناب جسٹس محمد افضل چیمہ (جج سپریم کورٹ، سیکرٹری وزارت قانون)، جناب جمیل حسین رضوی (ریٹائرڈ جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ)، جناب جسٹس قادر نواز اعوان (ریٹائرڈ جج سندھ ہائی کورٹ)، محترمہ ڈاکٹر مس کنیز یوسف (وائس چانسلر قائد اعظم یونیورسٹی)، جناب ڈاکٹر عبدالواحد جے ہالے پوتہ، جناب ڈاکٹر پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی)، جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی، جناب مولانا محمد حنیف ندوی (ڈپٹی

ذوالفقار علی بھٹو اور جسٹس حمود الرحمٰن

ڈائریکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور)، جناب مولانا محمد بخش مسلم، جناب مولانا نجم الحسن کراروی (پشاور)، جناب مولانا ارشاد الحق (کراچی) اور جناب جسٹس زیڈ اے چنا (جج سپریم کورٹ، سیکرٹری وزارت قانون) (رکن بلحاظ عہدہ) شامل تھے۔ بعد میں جناب جسٹس عبدالحیٔ قریشی (جج سپریم کورٹ، سیکرٹری وزارت قانون) (رکن بلحاظ عہدہ) ہوئے۔ اس کے علاوہ ۹ مئی ۱۹۷۴ء کو مولانا محمد ضیاء القاسمی، خطیب جامع مسجد غلام محمد آباد کالونی لائل پور کا، ۱۸ ستمبر ۱۹۷۴ء کو مولانا احتشام الحق تھانوی[113] کا، ۲۳ اکتوبر ۱۹۷ء کو ڈاکٹر معین الدین بقائی[114] اقتصادی مشیر، وزارت خزانہ، حکومت پاکستان کا بطور رکن تقرر ہوا۔ سیکرٹری

110 - احیائے دستور ۱۹۷۳ء کا فرمان، ۱۹۸۵ء (فرمان صدر نمبر ۱۴ مجریہ ۱۹۸۵ء) کے آرٹیکل ۲ اور جدول کی رو سے ''پارلیمنٹ'' کی بجائے تبدیل کیئے گئے۔

111 - قواعد (ضابطہ کار) اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۹۷۴ء کے لیے دیکھئے جریدہ پاکستان، غیر معمولی، حصہ دوم، صفحات ۷۱- ۷۳۔

112 - سیّد افضل حیدر، اسلامی نظریاتی کونسل ارتقائی سفر اور کارکردگی، ص ۶۳، ۶۷۴

113 - بذریعہ نوٹیفکیشن نمبر ایف۔۱ (۲) ۷۳۔اے۔آئی۔آئی بتاریخ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۴ء

114 - بذریعہ نوٹیفکیشن نمبر ایف۔۲۱ (۲) ۷۳۔اے۔آئی۔آئی مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء

وزارت قانون و پارلیمانی امور بلحاظ عہدہ اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن تھے، وہ موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کے بھی رکن شمار ہوئے۔ ابتداء میں جناب جسٹس قاضی محمد گل رکن بلحاظ عہدہ رہے۔ پھر جناب جسٹس محمد افضل چیمہ، ان کے بعد جناب جسٹس زیڈ اے چنا اور آخر میں جناب جسٹس عبدالحئ قریشی بلحاظ عہدہ رکن مقرر ہوئے۔ اس طرح دو ارکان کے اضافے سے کونسل کے اراکین کی تعداد ۱۳ سے ۱۵ ہو گئی جو کہ اس وقت آئین میں مقرر کردہ تعداد کی آخری حد تھی۔ مولانا ارشاد الحق تھانوی ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

دستور پاکستان ۱۹۷۳ء کے تحت "اسلامی نظریاتی کونسل" کی پہلی تشکیل کے دوران کونسل کی تحقیقی معاونت کے لیے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا تعاون حاصل رہنے کے ساتھ ساتھ کئی اضافی اقدامات بھی کیے گئے۔ پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت کے وزیر مذہبی امور نے کونسل کے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں معاونت کے لیے خصوصی دلچسپی لی۔ اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل کے تحت اس کے چیئرمین علامہ علاء الدین صدیقی ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو مرکزی حکومت سے کونسل میں ایک "لیگل ریسرچ سیکشن" قائم کرنے کی سفارش کر چکے تھے اور اس کے تحت کچھ آسامیاں اس وقت تخلیق کی جا چکی تھیں۔[115] کونسل کی اس تشکیل کے اندر یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ سے استفادہ کرنے کے علاوہ کونسل کے اپنے تحقیقاتی عملہ میں اضافہ ضروری ہے تاکہ فوری مسائل کے حل کے لیے اس سے ابتدائی تحقیق کرائی جا سکے۔ اس فیصلہ کے تحت تین ریسرچ اسسٹنٹ کی اسامیوں کی منظوری لے کر درخواستیں طلب کی گئیں اور ممبران کونسل کی سہ رکنی کمیٹی نے امیدواروں میں سے موزوں افراد کا انتخاب کیا۔[116] اس کے علاوہ کونسل کے دوسرے سال ۱۹۷۵- ۷۶ء کا پہلا اجلاس ۱۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو بمقام راولپنڈی منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی نے شرکت کی اور حاضرین مجلس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کونسل سے اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ مختلف مکاتب فکر کو سامنے رکھ کر احوال زمانہ کے چیلنج کا خاطر خواہ جواب پیش کرے اور دورِ حاضر کے ہر دم بدلتے ہوئے حالات اور مسائل کو بصیرت کے ساتھ اسلام کے اٹل اصولوں کی روشنی میں حل کرے۔ انہوں نے حکومت کی طرف سے ایسی تمام مراعات اور سہولتیں فراہم کرنے کا یقین دلایا جو کونسل کو اپنا مقصد شایان شان طریقے سے حاصل کرنے میں مدد دے سکتی ہوں۔ انہوں نے وزارت میں "ریسرچ اینڈ ریفرنس سیل" کی تشکیل، بین الاقوامی کلوکیمز کا انعقاد اور اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور متعلقہ بین الاقوامی اداروں کے مابین اشتراک کے انتظامات کا بھی ذکر کیا۔ حکومت نے ریسرچ اسسٹنٹس کی آسامیوں کو ترقی دے کر اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر گریڈ ۱۶ کی اسامیوں میں تبدیل کر دیا اور کچھ مزید اسامیاں تخلیق کرنے کی منظوری دی۔[117]

کارکردگی

نئے دستور ۱۹۷۳ء کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ پہلی سہ سالہ تشکیل کے پہلے سال (۱۹۷۴- ۱۹۷۵ء) کونسل کے کل چار اجلاس ہوئے[118]، دوسرے سال (۱۹۷۵- ۱۹۷۶ء) کونسل کے چار اجلاس ہوئے،[119] اور تیسرے سال (۲ فروری ۱۹۷۶ء۔یکم جنوری ۱۹۷۷ء) میں کل پانچ اجلاس ہوئے۔ اس کونسل کی سہ سالہ میعاد ۲ فروری ۱۹۷۷ء کو پوری ہو گئی۔

اس عرصے میں کونسل نے معاشرے کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کی غرض سے ۳۱ سفارشات کیں۔ اس سہ سالہ کارکردگی کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سال ۱۹۷۴- ۷۵ء: اسلامی معاشرہ کا قیام اور نظام زکوٰۃ کا اجراء، حکومت آزاد جموں و کشمیر کے مسودات اسلامی قوانین کے جائزے اور پاکستان کوڈ- جلد اوّل کا جائزہ، سال ۱۹۷۵- ۷۶ : اسلامی معاشرہ کا قیام؛ تبلیغ، تعلیم و تربیت، زکوٰۃ اور ربا، قوانین پر نظرِ ثانی؛ پاکستان کوڈ (جلد اوّل) کے ۲۰ قوانین، پاکستان کوڈ (جلد دوم) کے ۱۶ قوانین، پاکستان کوڈ (جلد سوم) کے ۲۶ قوانین، پاکستان (جلد چہارم) کے ۱۰ قوانین، پاکستان کوڈ (جلد پنجم) کے ۶ قوانین، پاکستان کوڈ (جلد ششم) کے ۱۱ قوانین، پاکستان کوڈ (جلد ہفتم) کے ۱۳ قوانین۔ سال ۱۹۷۶۔ ۷۷ : اسلامی معاشرے کا قیام؛ تبلیغ، تعلیم و تربیت، زکوٰۃ اور ربا، ارباب اقتدار کا طرزِ عمل، سماجی جرائم، عصمت فروشی، جوئے کا انسداد، زکوٰۃ اور ربا، مسکرات کا استعمال، پاکستان کوڈ جلد اوّل، پاکستان کوڈ جلد دوم، پاکستان کوڈ جلد سوم، پاکستان کوڈ جلد چہارم، پاکستان کوڈ جلد پنجم، پاکستان کوڈ جلد ششم، پاکستان کوڈ ہفتم، پاکستان کوڈ جلد ہشتم کے قوانین شامل ہیں۔

115- اسلامی نظریے کی مشاورتی کونسل، دس سالہ رپورٹ، جلد اول، ص ۹۰
116- اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ عبوری رپورٹ برائے ۱۹۷۴ء— ۱۹۷۵ء، ص ۵
117- اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ عبوری رپورٹ برائے ۱۹۷۴ء— ۱۹۷۵ء، ص ۹۵- ۹۶
118- اسلامی نظریاتی کونسل: سہ سالہ رپورٹ، سالانہ عبوری رپورٹ برائے ۱۹۷۴ء— ۱۹۷۵ء، ص ۵
119- اسلامی نظریاتی کونسل: سہ سالہ رپورٹ، سالانہ عبوری رپورٹ برائے ۱۹۷۵ء- ۱۹۷۶، ص ۹۲

تینوں سالوں کی مجموعی سفارشات یہ تھیں: پاکستان میں ہجری تقویم کا اجرا، جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل، سادہ قومی و سرکاری لباس، اوقات صلوٰۃ میں تقریبات کا التوا، ملازمین کی سالانہ خفیہ رپورٹوں میں دینی رجحان کا اندراج، مقابلے کے امتحان میں اسلامی نظریۂ حیات کا مضمون، دفتری اوقات میں اقامت صلوٰۃ کا اہتمام، مسجد کی مرکزیت، تعمیر مساجد، نماز جمعہ میں اصحاب اقتدار کی شمولیت، مساجد کے درس میں خواتین کی شمولیت، تعلیم میں پرائمری سطح تک ثنویت کا خاتمہ، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے اسلامی نظام تعلیم کا تفصیلی نوٹ، اسلامی شخصی قوانین کی تدریس، ریڈیو ٹی وی پر پنجگانہ اذان، تبلیغ اسلام کے لیے سرکاری انتظامات، فرقہ وارانہ منافرت کم کرنے کے لیے اقدامات، سادہ طرز زندگی کا فروغ، زکوٰۃ کی تنظیم، ربا کی ممانعت، حرام اشیاء کی سرکاری تقریبات میں ممانعت، ہوٹلوں اور عام مقامات پر حرام اشیاء کے استعمال کی ممانعت، عریانی و فحاشی کی روک تھام بذریعہ ذرائع ابلاغ عامہ، رقص و سرود کی ممانعت، فلم، سٹیج و ٹی وی پر نسوانی رقص کی ممانعت، دیگر سماجی برائیوں کی ممانعت، عصمت فرشی کی ممانعت، تعزیراتِ پاکستان میں سزائے زنا میں ترمیم، گھوڑ دوڑ کی ممانعت، احترام روزہ[120]۔

جنرل ضیاء الحق کی بطور صدر پاکستان حلف برداری کی تقریب

یہاں تک پاکستان کے تیس سال مکمل ہوئے اور اس مضمون میں اسی مدت کا احاطہ پیش نظر تھا۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق صاحب کا دور آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کونسل نے موجودہ قوانین کی اسلامی تشکیل پر اپنی حتمی رپورٹ پیش کر دی۔ ۱۹۷۳ء کے بعد بننے والے قوانین کے بہت سے حصے پر سفارشات مرتب کر کے پارلیمان اور صوبائی اسمبلیوں کو بھیجیں، صدر مملکت، گورنر صاحبان اور پارلیمان کے استفسارات کے جوابات مہیا کیے، اسلامی احکام کی اس انداز سے تدوین کر دی کہ انہیں براہ راست بطور قانون نافذ کیا جا سکے اور اس کے علاوہ معاشرے کی اسلامی تعمیر نو کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی: ﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ [الحج ۲۲: ۴۱] (یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے) کی روشنی میں پورا عملی خاکہ تیار کیا گیا جس کی رو سے طے کیا گیا کہ اقامتِ صلاۃ، معاشرتی برائیوں کا خاتمہ اور ایتائے زکوٰۃ کے ذریعے صحیح اسلامی معیشت کا قیام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حدود و تعزیرات اور اخلاقی ضوابط کے نفاذ، معاشرے کی تہذیب واصلاح کے فرائض حکومت کو انجام دینے ہیں۔[121] پھر اس خاکے کے مطابق علمی تیاری کے لیے جنرل ضیاء الحق صاحب کا پورا دور اور اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اور بعد کے کئی ادوار میں اسی ترتیب سے کونسل میں کام ہوتا رہا جو بہت بڑا علمی و فکری سرمایہ ہے اور حالات و زمانے کی رعایت رکھتے ہوئے معمولی حک و اضافے کے ساتھ نفاذ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بہت سے معاشرتی شعبوں کے بارے میں پورے نظام پر مشتمل موضوعاتی رپورٹیں بھی تیار کر کے پیش کی گئیں۔ معاشرے کی اسلامی تعمیر نو کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں کئی ادارے قائم کیے گئے اور کئی اقدامات کیے گئے۔ ان کی تفصیل کے لیے مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ یہاں سر دست قیام پاکستان کے پہلے تیس سالوں میں تعمیر نو کے اقدامات کی اہم مثالوں کے ساتھ اس کی نظریاتی تشکیل کا تذکرہ مقصود تھا۔ البتہ ان اداروں کو جو نیم مردہ حالت میں اب تک زندہ ہیں اور ان عملی اقدامات کو جو کسی نہ کسی صورت میں وجود رکھتے ہیں زندہ کرنے کے لیے اور اس مقصد کے لیے نئے عملی اقدامات کے لیے کچھ تجاویز پیش خدمت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں اس سے استفادے کی صورت نکل آئے:

تجاویز

اسلامی تہذیب و ثقافت کی تشکیل نو کے بارے میں اب تک جس قدر کام ہو سکا ہے اس کی ابواب بندی کر کے ہر خاص و عام کی اس تک رسائی ممکن بنا دی جائے تو درجِ ذیل طریقوں سے ان سے استفادے کی کوشش کی جا سکتی ہے:

أ۔ ایسی تجاویز جن پر افراد اور معاشرہ خود عمل کر سکتا ہے، اس پر خود عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ب۔ ایسی تجاویز جن کے لیے علماء، مدرسین، ائمہ مساجد، اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ رہنمائی اور بعض اوقات عمل کروانے کا کردار ادا کر سکتے ہیں، وہ اس کو اپنے پروگرام میں شامل کریں۔

ج۔ ایسی تجاویز جن میں وزارتیں اور سرکاری ادارے اپنے طور پر اقدامات کر سکتے ہیں، ان سے درخواست کی جائے کہ مناسب اقدامات کریں۔

د۔ ایسی تجاویز جن میں صرف حکومتی انتظامی حکمنامے جاری کرنے کی ضرورت ہے، حکومت سے ایسا کرنے کی درخواست کی جائے۔

ھ۔ ایسی تجاویز جن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے، ان کی تجویز عوامی نمائندوں کے ذریعے مقننہ کو دی جائے۔

120- اسلامی نظریاتی کونسل، سہ سالہ رپورٹ، تیسری رپورٹ برائے سال ۱۹۷۶- ۷۷ء، ص ۲۵۹- ۲۶۴

121- خاکے کا مفصل نقشہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۱۳۹۷- ۹۸ھ/ ۱۹۷۷-۸۸ء، ص ۹- ۱۰ میں شائع شدہ ہے۔

اسلام اور مغرب

تصورِ علم کا تصادم و توافق

ساجد شہباز خان

چیئرمین

شعبہ علوم المذاہب

یونیورسٹی آف سنٹرل

پنجاب، لاہور
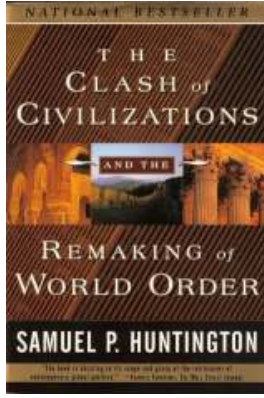
مغرب پچھلی کئی صدیوں سے عالم اسلام کے ساتھ کشمکش میں کھڑا ہے۔ خاص طور سے اگر علمی میدان کی بات کریں تو مستشرقین کی ایک لمبی فہرست ہے، جو خم ٹھوک کر نقد و جرح کے کام میں مگن ہے۔ نقد و جرح بالذات ایک مستحسن عمل ہے، کرنے والے کی نیت کچھ بھی ہو، جس پر نقد ہوتا ہے اس کے لیے سوچنے، غور کرنے اور اپنے دفاع میں نئے نئے علمی پہلوؤں کو دریافت کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اگر مستشرقین نہ ہوتے تو ہم قرآن و حدیث اور سیرت مطہرہ کے دفاع میں ہونے والے شاندار کام سے محروم رہ جاتے۔ جس سے اسلام کی حقانیت کے نئے باب ہم پر عیاں ہوئے ہیں۔

مستشرقین کے کام کے بالاستیعاب مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی بے اعتدالیوں اور لغزشوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی علوم کو اپنے تصور علم کے تحت سمجھنے کی کوشش کی ہے جبکہ ان کا تصورِ علم اسلام کے تصور علم سے ہم آہنگ نہیں۔ ہنٹنگٹن وغیرہ نے clash of civilizations جیسی کتابیں لکھ کر یا تو اصل مسئلے سے اہل اسلام کی توجہ ہٹائی ہے، یا پھر یہ لوگ مغرب و مشرق کے اصل فرق کو نہیں سمجھ سکے۔ راقم کے خیال میں یہ clash of civilizations نہیں بلکہ یہ علمی میدان میں Clash of approaches ہے۔

استشراق اور اسلام سے تصادم

اورینٹل ازم (استشراق) بظاہر علم کی ایک شاخ ہے، لیکن حقیقت میں یہ علمی پہلو، سے کم اور عملی اور بین الاقوامی سیاست سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ فزکس، کیمسٹری، بایو کیمسٹری، ٹکنالوجی اور پولیٹیکل سائنس کا بھی اتنا تعلق سیاست سے نہیں ہوگا، جتنا اورینٹل ازم کا ہے۔ مسلمان علما نے اسے مغرب کے لادینی پراپیگنڈے، اسلام فوبیا کے مرض کا نتیجہ یا اسلام دشمنی کا شاخسانہ سمجھا، اور اس سے الگ ایک علم کے طور پر برتاؤ کیا۔ لیکن یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ پورے پلان اور اسکیم سے معاملہ کیا جاتا۔ چنانچہ یہ کاوش کچھ زیادہ سود مند نہیں رہی۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے کہ آپ کو ملیریا ہوا ہو، جس کا ایک اہم جزو سردی لگنا ہے، تو آپ سردی کا علاج کرتے رہیں، اور کمبل پہ کمبل اوڑھتے رہیں، لیکن ملیریا کا علاج نہ کریں۔ اس سے مرض نہیں جائے گا مگر آپ سمجھیں گے کہ میں نے تو بہت اعلیٰ علاج کیا اور نہایت عمدگی اور محنت سے تیمار داری (nursing) بھی ہوئی۔ لیکن شفا نہ ہوئی۔ ہماری تمام مخلصانہ کاوشوں اور مساعی کا معاملہ بھی یہی رہا ہے۔ ہم سردی لگنے کا علاج کرتے رہے اور ملیریا مریضِ عزیز کی جان لے گیا۔ اس لیے اس بات کو سمجھنا ازبس ضروری ہے کہ اورینٹل ازم کیا ہے، یہ محض سردی لگنا ہے، یا ملیریا ہے؟
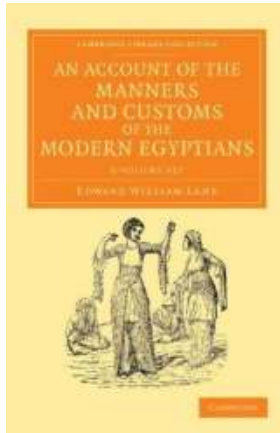
عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مستشرقین نے مشرقی اقوام کا مطالعہ اس لیے کیا ہے کہ وہ ان کو سمجھ کر ان کے نفسیات کے مطابق ان پر حکومت کر سکیں۔ مثلاً ایڈورڈ لین کی کتاب کا عنوان ہی دیکھ لیجیے: An Account of the Manners and Customs of the Modern Egyptian۔ بلاشبہہ کسی حد تک یہ بات بھی صحیح ہے۔ لیکن صرف ایسا نہیں ہے۔ یہ دراصل مغربی پروگرام کا آدھا بیان ہے۔ کیونکہ اگر سمجھنا ہی کافی ہوتا تو بس سمجھ جاتا، نہ اسے رد کرنے کی ضرورت تھی اور نہ اس کا مذاق اڑانے کی۔ دراصل ایک اور ایجنڈا بھی ہے جسے کئی نام دیے گئے ہیں لیکن اس کا اصل نام spread of western civilization یا دوسرے لفظوں میں civilizing mission ہے۔ یہ دنیا کو مغربی انداز میں مہذب (civilized) بنانے کا مغربی ایجنڈا ہے۔ اس ایجنڈے کے ساتھ دوسرے

مقاصد بھی موجود ہیں، جیسے مغربی غلبہ کا استمرار اور مغرب کا معاشی استحکام وغیرہ۔ لیکن اورینٹل ازم جیسی چیزوں کا اصل ہدف وہی ہے جسے ہم نے civilizing mission کے نام سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم دونوں ایجنڈوں کا استشراق کے ساتھ تعلق واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا ایجنڈا اور استشراق

پہلا ایجنڈا جسے تہذیبی مشن (civilizing mission) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے نام ہی سے واضح ہے کہ اس کے پروگرام کی نوعیت کیا ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب، ثقافت، تہذیب، تمدن، فنون، رسم و رواج، اندازِ بود و باش، سیاست کے حوالے سے جہاں غیر مہذب عناصر پائے جائیں، ان کی جگہ مغربی "مہذب عناصر" کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جب مغرب گھر سے نکلا تو اس کا خیال تھا کہ "اچھی چیز" ہر جگہ بکتی ہے۔ لیکن تمام معاملات میں ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی پتلون اور کوٹ تو شاید جلد بک گئے مگر ان کی بہت سی چیزیں رد کر دی گئیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں پھر انھوں نے تہذیبوں کا گہرا مطالعہ کیا کہ وہ کیا چیزیں ہیں، جو ان کی دی ہوئی "بہتر" باتوں کو ماننے میں رکاوٹ ہیں۔ اس رخ سے مطالعے کا آغاز ان کو غلط یا صحیح باتوں تک لے گیا۔ مثلاً کبھی ان کو خیال ہوا کہ جہاد کا جذبہ مسلمانوں کی طرف سے نئی باتوں کو ماننے کی راہ میں رکاوٹ ہے، کبھی خیال ہوا کہ حدیث رکاوٹ ہے اور کبھی قرآن، کبھی مسلمانوں کی تاریخ اور کبھی مدرسہ و محراب۔ اورینٹیل ازم ان رکاوٹوں کو جاننے اور ان کے دور کرنے کا نام ہے۔ یعنی مہذب بنانے میں رکاوٹیں کیا ہیں، اور ان کو کیسے زائل کیا جائے۔ مثلاً پینٹ کوٹ کے اپنانے، مغربی بود و باش کے اختیار کرنے میں رکاوٹ کیا ہے؟ اسلامی تعلیمات! وہ کہاں ملتی ہیں؟ حدیث میں اور فقہ میں۔ دورِ اول کے اہل الرائے کے بعد کی تمام فقہ کی اساس اسی حدیث پر ہے، تو اصل ہدف کیا ہوا؟ ظاہر ہے حدیث۔
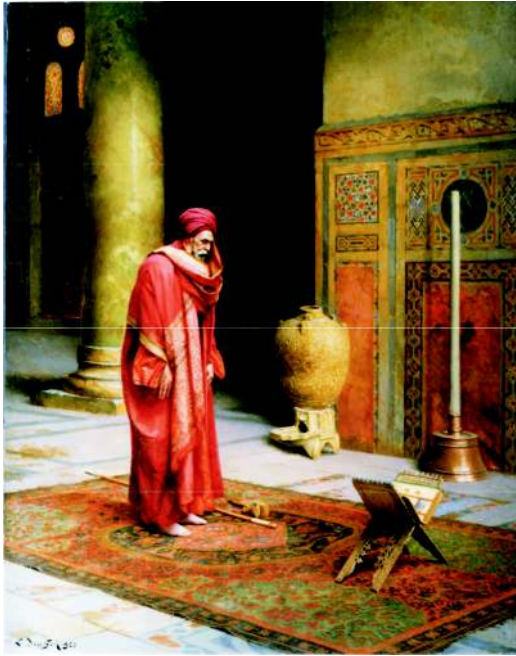
ایک اور مثال لیجیے سیکولرازم کو اپنانے میں رکاوٹ کیا ہے، ہمارا ایمان، ایمان کی اساس کیا ہے، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اورینٹل ازم کا ہدف کیا ہوا؟ ظاہر ہے قرآن اور نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ لہٰذا قرآن اور حدیث اگر غلط ثابت ہو جائیں، اور پیغمبر محض ایک عظیم لیڈر ثابت ہو جائیں، نبوت کا مسئلہ غائب ہو جائے تو آیا تمام بڑی رکاوٹیں زائل نہیں ہو جائیں گی؟

اب اگر آپ سترھویں صدی کے بعد سے لے کر آج تک کے اسلام پر مغربی کام کا مطالعہ کریں تو آپ اسے تین نکات میں بیان کر سکتے ہیں۔

- پیغمبر اسلام کو محض ایک مخلص مصلح reformer ثابت کیا جائے، تاکہ مذہب اسلام دین کی بجائے ایک مفکر کا فکر و فلسفہ قرار پا جائے، جیسے مانی، کنفیوشش وغیرہ۔ وہ ایک مذہب کے بانی [1] ضرور ہیں، لیکن یہ مذہب نعوذ باللہ بعض ذہنی بے قاعدگیوں کا ثمر تھا، نہ کہ وحی الٰہی کا۔
- حدیث قرن ثانی و ثالث کی علمی اور سیاسی سازشوں کی پیداوار ہے، اس کی پیغمبر سے نسبت ہی صحیح نہیں ہے۔
- قرآن مجید بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے۔ لیکن اسے صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا، اور نہ صحابہ اسے صحیح ترتیب دے سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بعض مختلف النوع کیفیات میں نبی کی وارداتِ قلبی [2] ہے۔ جو مبہم کلام کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے، جیسا کہ مذہبی پروہتوں کا کلام مبہم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے نئے ترجمے اور نئی ترتیب دینے کی کوششیں کی گئیں۔ (أعوذ باللّٰه من ان أكون منهم، اس نقل کفر پر خدا مجھے معاف کرے)۔

ان نظریات کو دوبارہ دیکھیے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب محمد بن عبداللہ خدا کے رسول نہیں ہیں تو اسلام اللہ کا دین ہی نہیں رہے گا۔ جب وہ اللہ کا دین نہیں ہے، تو اس کو بطور دین ماننے کی ضرورت اور ایمان لانے کی فکر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن و حدیث غیر وحی اور غیر مستند یا ناقابل فہم ہیں۔ جب یہ چیز مختلف ذرائع سے ثابت کر دی جائے گی، تو اسلام بطور ایک مذہب اپنا کردار کھو دے گا۔ جس کے بعد مسلمانوں کو نئی تہذیب کی پٹی پڑھانی آسان ہو جائے گی۔

1- نبی نہیں بانی، اسلام کو Muhammadan کہنے میں بھی یہی ذہن کارفرما تھا۔

2- Epileptic fits کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا اتہام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض لاخیرے استشراقیوں نے لگایا ہے۔

ایک طرف اسلام کے ساتھ یہ کیا جارہا تھا تو دوسری طرف اہل مغرب کی بھی ایک نہایت شاندار تصویر پینٹ کی جارہی تھی۔ نہ صرف اس کام سے جسے ہم استشراق کے نام سے جانتے ہیں، بلکہ دوسرے ذرائع سے بھی یہ تصویر مسلمانوں کے ذہنوں میں پینٹ کی گئی۔ وہ تصویر یہ تھی کہ مغرب کے پاس اعلی محققین ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ محنتی ہیں۔ جس طرح وہاں سائنس دان صرف تجربہ سے ثابت شدہ بات کرتے ہیں، ایسے ہی استشراقی بھی تحقیق و دلیل سے بات کرتے ہیں۔ اہل مغرب مسلمانوں کے عظیم المرتب متقدمین علماء سے زیادہ محنتی اور بااصول ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ عقل و شعور اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے، لہٰذا ایسی باتیں ان علماء کی نگاہ سے اوجھل رہیں، جو اصل میں غلط تھیں۔ مثلاً وہ استنادی مباحث میں لگے رہے اور متن پر توجہ نہ دے سکے جبکہ مغرب صحتِ فکر اور صحت منہج پر کھڑا ہے اور دقیانوسیت سے پاک ہے، وغیرہ۔ یہ باتیں استشراق کو باوزن کرنے کے لیے تھیں، اور مسلمانوں کو ان کے عروج کے دور میں بھی پسماندہ ثابت کرنے کے لیے تھیں۔

دوسرا ایجنڈا اور استشراق

دوسرا ایجنڈا جو مذکورہ بالا ایجنڈے کے لئے معاون کے طور پر کام کرتا ہے غلبہ مغرب کے استقلال و استمرار کا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ساری دنیا مغربی مصنوعات کی منڈی بن جائے، اور دوسرے یہ کہ سیاسی طور پر دیگر اقوام، یعنی مشرقی اقوام کو مغلوب رکھا جائے۔

اس کی خاطر بھی انھی چیزوں کی ضرورت تھی، جو civilizing mission میں مطلوب تھیں، لیکن یہاں ان کی صورت اور رخ اور ہے۔ مثلاً پوری دنیا ان کی منڈی بنے، اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا مغربی مصنوعات کو خریدنا چاہتی ہو۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا میں ان کی مانگ پیدا کی جائے۔ مثلاً جینز کی پتلون پوری دنیا میں فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری دنیا جینز پہننا چاہتی ہو۔ میکڈونلڈ کی مانگ کے لیے ضروری ہے کہ پرانے زمانے کے گھر کے کھانے کھانے کا رواج کم ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ شوہر دیسی نخرے والا نہ رہے، بیوی کے لیے کچھ اور مصروفیات بھی ہوں، جن کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکے۔ یہ گویا سارے تمدن کی تبدیلی کے مترادف تھا۔ ان میں بھی اگر آپ غور کریں تو کچھ چیزیں مذہب سے جڑی ہیں۔ پینٹ اگر پہننا ناپسندیدہ ہے، اور مہاتما گاندھی کے لیے پورا جسم ڈھانپنا ہی ممنوع ہے تو آیا اپنی پتلون بیچنے کے لیے ایسے مذہب کو مار بھگانا نہیں ہو گا؟

اب مذہب کو مار بھگانے کے لیے سب سے مؤثر ہتھیار کیا ہو گا یہی کہ اسے غلط، ناقابل فہم، دقیانوسی، یا قدیم و فرسودہ قرار دے دیا جائے۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو مذہب کا ایسا تصور پروان چڑھایا جائے جو جدید مغربی تہذیب و تمدن اپنانے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ اس کے لیے مذہب کا ایک طرف محض روحانی اور دوسری طرف ذاتی تصور (secularism) رائج کیا گیا۔ اور اس دوسرے کی کوکھ سے محض اخلاقی (عقیدے سے مجرد) مذہب خود بخود پیدا ہو گیا، جسے Humanism کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور اسی کی گود میں الحاد (atheism) نے پرورش پائی ہے۔ گویا الحاد اور ہیومنزم جڑواں بھائی ہیں۔ مذہب کے روحانی تصور کا مطلب یہ ہے کہ چند مذہبی رسومات کے بعد آدمی دیگر مذہبی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔ دین کا اخلاق اور عمل صالح سے اصلاً کوئی تعلق نہ ہو۔ مذہب رہن سہن، تمدن اور بود و باش سے الگ ہو جائے۔ یہ ذہن اس بات پر جرآت دیتا ہے کہ آدمی آسانی سے ان مذہبی تعلیمات سے گریز کر سکتا ہے جو غیر روحانی قسم کی ہوں، جن کے بارے میں وہ آرام سے کہہ سکے کہ ان کے نہ اپنانے میں کیا حرج ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے بھی یہی سب سے مؤثر ذریعہ تھا کہ ان تمام تعلیمات کو فرسودہ، دقیانوسی، یا کم از کم غیر مذہبی ہی قرار دے دیا جائے۔ لہٰذا اورینٹل ازم یہاں بھی خدمت کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے صرف چند خاص تعلیمات کو ہدف بنانا ضروری تھا۔ چنانچہ عورت، لباس، فیشن، فنون لطیفہ، حدود و تعزیرات، جہاد جیسے موضوعات پر اسلام کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ عورت آزاد ہوئی، معاشرت میں بے حساب تبدیلیاں آئیں۔ کاسمیٹکس سے لے کر فیشن تک اور میکڈونلڈ سے لے کر ٹن پیک مصنوعات تک ہر چیز کی منڈی کھل گئی۔

چلو بازار چلتے ہیں، یہاں ہر چیز بکتی ہے

اب دوسرے جزو کو لیجیے کہ سیاسی طور پر دیگر اقوام، یعنی مشرقی اقوام کو مغلوب رکھا جائے۔ اس کے لیے مسلمان ہی سب سے بڑا ہدف تھے۔ اس کی دو جہتیں ہیں:

- ایک یہ کہ عیسائیت کے علاوہ اگر کوئی مذہب اپنے ماننے والوں کی سب سے زیادہ تعداد رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ عیسائیت سے انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ سیاسی و معاشرتی نظام کے حوالے سے تعلیمات میں پہلے ہی نہایت کم سرمایہ رکھتی ہے۔ اور ویسے بھی وہ ان کا اپنا مذہب ہے۔ جبکہ اسلام اپنے ماننے والوں کو متحد کر کے کسی بھی وقت ایک ملت بنا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام پر زیادہ توجہ دی گئی۔
- دوسری وجہ یہ کہ اہل اسلام ایک شاندار ماضی رکھتے ہیں، جب وہ تقریباً تمام دنیا پر حاکم تھے۔ یہ ماضی انھیں پھر سے آمادۂ سلطانی کر سکتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے ایسے کانٹے بوئے جائیں کہ وہ ایسا سوچ بھی نہ سکیں۔ اس کے لیے ایک تو ان کے جوڑنے والی قوت یعنی اسلام غیر معتبر کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اندر ایسی ذہنی بے بضاعتی کا احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ از سر نو اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ یہاں دیکھیے کہ پہلے کام کے لیے پھر اورئینٹلزم کی ضرورت ہوئی۔ اور دوسرے کام کے لیے وہی مغربی تصویر کشی کی۔

لہٰذا دونوں ایجنڈے اس قدر مشترک العمل تھے کہ ہر کام دو دھاری تلوار تھا۔ استشراق ایک طرف اسلام کو غیر معتبر کرنے کا کام کر رہا تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کے ذہن میں مغربی برتری کی دھاک بٹھا رہا تھا۔

مسلمانوں کی ذہنی و نفسیاتی تخریب

اس کام کا نتیجہ مسلمانوں کی نفسیاتی تخریب کی صورت میں نکلا۔ یہ نفسیاتی تخریب درج ذیل پہلوؤں سے کی گئی:

۱۔ یہ ذہن بنایا گیا کہ مغرب برتر اور مشرق فروتر ہے۔ یہ نفسیات تاحال قائم ہے۔

۲۔ یہ تصور دیا گیا کہ مغرب مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے۔ مسلمان سازشوں کا شکار ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں مظلوم ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ مظلوم ہونے کا احساس کام سے روکتا اور دادرسی اور خود رحمی کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی کام مظلوم کے ہاتھوں ہو بھی تو وہ واویلا، احتجاج اور ہنگامہ برپا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان میں تخریبی کارروائیاں اسی مظلومانہ ذہن کی تخلیق ہیں۔ مظلوم (frustrated) ذہن اتنا تندرستی سے سوچ ہی نہیں سکتا کہ دیرپا پروگرام بنا سکے۔ قرآن مجید نے اسی حالت کو مسکنت کہا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ یہ ذہن بھی بنایا جائے کہ مغرب ظالم ہے، لہٰذا انھوں نے یہ ذہن بھی بنایا۔ یہ بات اہل مغرب بھی تسلیم کرتے ہیں جیسے نوم چومسکی وغیرہ۔

۳۔ مذہبی آدمی قومی و ملی امور کے نبھانے میں نکما ہوتا ہے۔ ابوالکلام کے مقابلے میں محمد علی جناح اور ظفر علی خان کے مقابلے میں لیاقت علی خان کو ترجیح حاصل ہوگی۔ آج تک انتخابات میں اسی کے نتائج دیکھے جا سکتے ہیں۔ مقبول ترین علما میدانِ سیاست میں چند ہی نشستیں جیت پاتے ہیں۔

۴۔ علم مغرب میں ہے۔ مشرق کا علمی دور ختم ہو گیا، بلکہ کبھی تھا ہی نہیں۔ علم یونان سے چلا اور فرانس و برطانیہ سے ہوتا ہوا امریکہ تک پہنچا ہے۔ مشرق کا انسانی ترقی اور علمی ارتقا میں کوئی اہم کردار نہیں ہے۔ مسلمانوں کا دور بھی بس ایک قوت کی بنا پر قائم حکومت تھی۔ جس نے شاید چند تراجم کے سوا علم کی کوئی خدمت نہیں کی۔

۵۔ دین و دنیا میں تفریق ہے۔ اس نے ناکام آدمی کے لیے زندگی کو اجیرن بنادیا ہے۔ مذہبی اقوام میں یہ چیز لامذہبیت کو رواج دیتی ہے۔ آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہم مذہب یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں، اللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب نہ ملنے پر الحاد چپکے سے ذہن میں گھر کر لیتا ہے۔

۶۔ مغرب اخلاق میں بھی بہتر ہے۔ وہاں عدل و انصاف کا بول بالا ہے۔ انسانوں کو وہاں پورے حقوق حاصل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب اصل چیز نہیں ہے، یعنی مذہب کے بغیر بھی حقوق انسان کی فراہمی کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کہ وہاں کی ساری اجتماعی اخلاقیات محض مادی لین دین کی اخلاقیات ہے۔ آج ہم بھی اسی طرف بڑھ رہے ہیں۔

۷۔ مغرب آزادی کا قائل ہے۔ وہاں مذہبی رواداری پائی جاتی ہے۔ آپ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ آپ کو مذہب کے بارے میں نہیں ستائیں گے۔ یہ نہایت عمدہ پردہ ہے ان مذہب مخالف سازشوں پر جو مغرب میں ہو رہی ہے۔ یہ رواداری دراصل اس لیے ضروری تھی کہ جب لوگ مذہب کو ترک کریں تو معاشرہ انھیں تنگ نہ کر سکے۔

۸۔ مادیت کو فروغ دیا گیا، معاشرے میں نیکی کی دوڑ کے علاوہ ہر دوڑ جاری کی گئی تاکہ اصل چیز نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۹۔ فنونِ لطیفہ، تفریح، فنکار، کھلاڑی، ان کو اتنا نمایاں کیا جائے کہ محبت و عقیدت کا رخ تبدیل کیا جائے۔ لوگ انھی کو اپنا آئیڈیل بنائیں۔ اور انھی کی راہ کو کامیابی کی راہ سمجھیں۔ پہلے یہ لوگ بدقماش سمجھے جاتے تھے، اب یہ راہنما ملت ہیں۔ عزت نیکی کو ملے، یہ تصور معاشرے سے ختم ہو گیا ہے۔

ان باتوں سے مسلمانوں کی نفسیات خراب کی گئی۔ وہ اب مظلومانہ، تھکے ہارے ذہن کے ساتھ، اس بچے کی طرح ہیں، جس پر ظلم ہو تو چیخنے چلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ کچھ کرتا بھی ہے تو وہ بچے ہی کی طرح دبا دیا جاتا ہے، کیونکہ غم و غصے اور جلد بازی و کمزوری میں کیے گئے اقدامات ناقص ہوتے ہیں۔ مصر کی اسرائیل کے ساتھ جنگ وغیرہ اسی کی عمدہ مثال ہے۔ اس ذہن سازی میں استشراق کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ استشراق نے اس ذہن سازی میں وہ کام کیا ہے، جو ایک تناور درخت کو گرانے کے بجائے جڑوں کو برباد کرنے سے ہوتا ہے۔ یعنی بظاہر درخت اپنی جگہ کھڑا رہے اور جڑوں سے محروم کر دیا جائے۔ یعنی امت مسلمہ کا تناور درخت اپنی جڑوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔ آج مذہب کا ایک ظاہری اور کھوکھلا تصور بس رہ گیا ہے۔ جس میں بصیرت اور للّہیت نہیں رہی۔

استشراق اور اسلام سے توافق

مندرجہ بالا گفتگو کے بعد یہ سرخی شاید بے محل لگتی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل استشراق کی ان فتنہ گریوں کو ہم اپنے لیے مفید بنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اصول کے مطابق مشکلات آتی ہیں تو یہ ہماری تطہیر[3] کے لیے آتی ہیں۔ ہمیں کندن بنانے کے لیے آتی ہیں۔ یہی اہل اسلام کا استشراق سے توافق ہے۔ مغرب ہماری خدمت کر رہا ہے کہ ہم اپنے اندر کے میل کو دھوڈالیں اور اس میل کو نکال باہر پھینکیں، تاکہ دوبارہ کندن بن جائیں۔ ہمیں اپنی تہذیب کو اپنی نظر سے دیکھنا سیکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے دین کو صحیح شکل میں سامنے لانا ہوگا۔ ہمیں اپنے اندر کی کوتاہیوں کو دور کرنا ہوگا تاکہ ہمیں دیکھ کر ہمارے دین کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ بقول غالب وہی حال نہ ہو کہ:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو۔

مغرب کا تصور علم اور اسلام سے تصادم

استشراق میں ایک غلطی وہ علمی کوتاہیاں اور بے ضابطگیاں ہیں جو مغرب نے علوم اسلامیہ کے ساتھ روا رکھی ہیں۔ تو دوسری غلطی تصور علم کے حوالے ہے۔ میرے خیال میں یہ تصادم کی اصل وجہ ہے۔ ہم اپنے ناقص علم کے مطابق اس پہلو پر نگاہ ڈالیں گے۔ پہلے مغرب کے تصور علم کو سمجھیں گے اور پھر اسلام کے تصور کو واضح کرکے توافق و تصادم پر بات کریں گے۔ استشراق اسی علمی بحث کا ایک جزو ہے۔ لیکن ہم نے اسے پہلے الگ سے اس لیے بیان کر دیا ہے کہ وہ ایک سیاسی طرز عمل کا شاخسانہ تھا۔ جس کا اصل میں علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس سیاسی کام کے نتیجے میں کچھ مشرق سے علمی شوق رکھنے والے لوگ بھی وابستہ ہوئے لیکن وہ اپنے پیش رووں کے اثر سے باوجود اخلاص کے بچ نہیں سکے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی اصل مآخذ تک عدم رسائی رہی تو دوسری وجہ تصور علم کا اختلاف تھا۔ ہمارے اس مقالے کا موضوع دراصل یہی ہے۔

مغرب کا تصورِ علم

گلیلیو، ڈیکارٹ، نیوٹن، ہیوم اور کانٹ کے فکر و فلسفہ نے اہل مغرب کے لیے علم ایک ایسی گتھی بنا ڈالی ہے کہ جو سلجھنے کا نام نہیں لیتی۔ ہیوم کی تشکیک کا کیا جواب ہے؟ عقل، تجربہ یا کچھ اور؟ اس سوال پر مغربی دنیائے علم میں کئی جواب دیے گئے ہیں۔ ایسا علم جو صحیح اور سچ ہو اسے عربی میں علم اور انگریزی میں truth کہتے ہیں۔ ہم اہل اسلام بھی خبر اور علم میں فرق کرتے رہے ہیں۔ علم، لغوی بحثوں میں اگرچہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ ظنی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اصولی بحثوں میں اسے بالعموم قطعی مانا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ تواتر علم کا فائدہ دیتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قطعی اور سچا علم حاصل ہوتا ہے۔ اصولی بحثوں میں علم کے مقابل میں چند اصطلاحات اور متداول ہیں: جیسے خبر، جس میں احتمال صدق و کذب پایا جاتا ہے۔ ظن جس میں صدق کا احتمال کذب سے زیادہ ہوتا ہے، شک جس میں کذب و صدق کا احتمال یکساں ہوتا ہے، وھم جس میں کذب کا احتمال غالب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مغربی فکر و فلسفہ میں knowledge خبر کے معنی میں ہے، جس میں صدق و کذب کا احتمال ہے، جب کہ truth وہ ہے جس میں صدق یقینی ہے۔ اس لحاظ سے علم الاصول کی اصطلاح: "علم" انگریزی کے علم العلم کی اصطلاح "truth" کے ہم معنی ہے۔ اور خبر اس قضیہ یا proposition کے ہم معنی ہے جو ابھی truth کے درجے تک نہ پہنچی ہو۔

گلیلیو

ڈیکارٹ

نیوٹن

کانٹ

3- القرآن: آل عمران ۳: ۱۵۴

علم کی سچائی کا فیصلہ
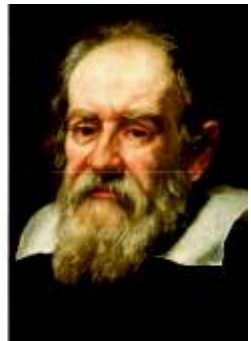
اب اصل بات کی طرف آتے ہیں، جس سے اصلاً مغرب و مشرق کا فرق واضح ہو گا۔ علم یا truth کیسے ثابت ہوتا ہے۔ مغرب میں اس کے لیے چار طرح سے جواب دیا گیا ہے[4]۔

پہلا جواب: Correspondence کا نظریہ ہے۔اس نظریے کے مطابق سچا علم وہ ہے جس کی باہر والی دنیا میں تصدیق ہو جائے۔ مثلا قضیہ preposition اگر یہ ہو کہ خالد مسجد میں ہے۔ تو یہ قضیہ اس وقت درست مانا جائے گا، جب خالد کو مسجد میں پالیا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ قضیہ باہری حقیقت سے correspond کرتا ہو یعنی مطابقت رکھتا ہو۔ اگر خالد مسجد میں نہ پایا گیا ہو، تو یہ قضیہ غلط ثابت ہو گا۔ بقول مولانا رومی:

آفتاب باآمد و دلیل آفتاب   گر دلیل تباید ازوی رُو متاب[5]

"سورج کے ہونے کی دلیل اس کا آنا ہے، لہٰذا اگر تم دلیل ہی چاہتے ہو، تو (اپنا چہرہ اسی کی طرف لگائے رکھو)، اس سے ہٹانا نہیں، (اس کے آتے ہی تم مان جاؤ گے)"

یہ ہمارا عام انسانی طرز عمل ہے کہ ہم چیز کو دیکھ کر یا دکھا کر مان لیتے ہیں۔ عام زندگی میں تو یہ اصول بہت اچھا ہے مگر ماضی کے علم کے لیے یہ نہایت ناقص ہے۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام اُر کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر اس قضیہ کے لیے کوئی باہری دنیا میں ثبوت نہ ملے تو اس نظریے کے مطابق ہمارا یہ اجماعی نقطۂ نظر بھی غلط ہو گا، کیونکہ نہ کسی پرانی کتاب میں ملا، اور نہ اس کے دیگر شواہد ہمارے سامنے آئے۔

اسی طرح اس نظریے میں دوسری خرابی یہ ہے کہ غائب از نظر حقائق کو ماننے میں رکاوٹ بنے گا۔ یومنون بالغیب کی حقیقت اس سے اوجھل رہے گی۔

دوسرا جواب: سچ کیا ہے، اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تعقل (reason) سے اس کی صحت کو جانا جائے۔ جیسے علم کلام میں کہا جاتا ہے کہ دنیا حادث ہے اس لیے اس کا احداث کرنے والی ذات چاہیے۔ یہ استدلال ایک منطقی صغرے کبرے پر کھڑا ہے۔ پہلے یہ بات مانی گئی ہے کہ دنیا حادث ہے، پھر یہ بات مانی گئی ہے کہ ہر حادث کے پیچھے کوئی محرکِ احداث ہوتا ہے۔ ان دو عقلی مسلمات کے بل پر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ کائنات کا خالق و محرک ہونا چاہیے۔ علم کلام جو کہ یونانی فلسفہ و منطق کی روشنی میں چلا، اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ القاضأ یا العقلية قطعية. یہی چیز مغربی علم میں بھی ایک حد تک مانی جاتی ہے کہ منطقی استدلال سے بھی حق ثابت ہوتا ہے۔

یہ اصول بھی واضح اور صاف ہے۔ لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے کہ اگر یہ اصول مجرد مانا جائے اور اس کے ساتھ empirical علم کو نہ جوڑا جائے تو پھر وہی صورت سامنے آتی ہے جس کے بارے میں فلسفیوں کے لطائف مشہور ہیں کہ گھر بیٹھے بحث کرتے رہے کہ عورت کے دانت زیادہ ہیں یا مرد کے، لیکن گن کر کسی نے نہیں دیکھے۔ لیکن اس اصول کو اگر empirical ڈیٹا کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جائے تو یہ نہایت مفید چیز ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی رائج ہو گئی ہے کہ سائنس عقلیت پر زور دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ سائنس اس طرح کی مجرد عقلیت کا انکار کرتی ہے۔ وہ کانٹ کی اصطلاح میں pure reasoning کی قائل نہیں ہے۔ وہ اس تعقل کو تجربے کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہے۔ ہماری کلامی روایت کے الفاظ مستعار لیے جائے تو قضایا عقلیہ کو تجربے کی سائنس پر پرکھنے اور اس کے بل بوتے پر مستقبل کی پیشین گوئی کر کے درست ثابت ہونے کا نام سائنس ہے۔ اقبال نے شاید اسی کو ایک شعر میں دانش برہانی کا نام دیا ہے:

اک دانش نورانی، اک دانشِ برہانی   ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

تیسرا جواب: یہ دیا گیا ہے کہ وہ بات صحیح ہے جو کام چلانے کے لیے مفید ہو۔ اسے pragmatism کہا جاتا ہے۔ مثلاً بجلی کے صحیح کام کرنے کے لیے دو تاریں لگتی ہیں۔ اس لیے یہی درست ہے۔ بہت سے سائنس دان نظریہ ارتقا کو اس لیے صحیح کہتے ہیں کہ بیالوجی کے علم میں اس سے بہت مفید اضافے ہوئے ہیں۔ سادہ لفظوں میں جو مسائل کو حل کرنے میں مدد دے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا عملی استعمال کس قدر مفید ہے یہ نہیں دیکھا

4- اس کو تفصیل سے جاننے کے لیے دیکھیے epistemology کے عنوان سے لکھی جانے والی کتب، مثلاً ایک بنیادی کتاب ہے:
Steup, Mathias. An introduction to Contemporary Epistemology. New Jersey: Prentice-Hall, Inc. 1998.

5- اگرچہ یہ شعر الٰہیات سے متعلق ہے، مگر اس میں correspondence کے نظریے کی جھلک ملتی ہے۔

جاتا کہ یہ بات درحقیقت صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ چیز تقلیدی مسالک میں ہمارے ہاں مانی جاتی ہے۔ سوشل سائنسز کے حوالے سے یہ مثال کہ بعض ملکوں میں جمہوریت کے بجائے ملوکیت کامیاب ہے، اس لیے اسی کو صحیح قرار دیا جائے۔ ہماری عدالتوں میں نظریہ ضرورت اسی فلسفہ کی ایک اطلاقی مثال ہے۔

چوتھا جواب: وہ ہے جسے ارتباط یا مربوطیت (coherence) کہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بات جو پورے نظام الفکر میں ٹھیک آتی ہو۔ مثلاً پرانا نظریہ کہ زمین ساکن ہے۔ موجودہ معلومات کے ڈھانچے میں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ ہمارے ہاں اس کو ایک محاورے میں بیان کیا جاتا تھا کہ: گول خانے میں چوکور میخ۔ اسی کو فلسفے میں inductive-logic بھی کہہ لیتے ہیں۔ جس میں مثلاً شرلک ہومز یا عمران کی ابن صفی کے ناولوں میں

توجیہات: جو تمام معلومات کو ملا کر ایک حقیقی مجرم تک پہنچاتی ہیں۔ وہ توجیہ اس لیے درست ہوتی ہے کیونکہ وہ عمران یا شرلک ہومز کو حاصل معلومات کے پورے ڈھانچے کو explain کر رہی ہوتی ہے۔

اسلام اور مغرب کا تفاوت

مغربی علم میں انھی چار دانشوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو مغرب و مشرق کا اتفاق ہے۔ لیکن مغرب ہم سے ایک چیز میں مختلف ہے۔ جسے ہم عقل و نقل کی ترکیب میں نقل کے نام سے جانتے ہیں۔ نقل سے بھی ایک دانش پیدا ہوئی ہے۔ اسی کو اقبال نے درج ذیل شعر میں فیضانِ سماوی کہا ہے۔ مغرب کے اس فیضان سے محروم ہونے کو علامہ اقبال نے نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم   حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اسلام اور مغرب کا اسی دائرے میں وہ اختلاف شروع ہوتا ہے، جسے ہم نے مقالے کے شروع میں Clash of Approaches کا نام دیا ہے۔ مغرب ان چیزوں کے علاوہ کسی پانچویں چیز کو مانے گا تو اس وقت مانے گا جب وہ ان چاروں کی طرح کی ہوں۔ ان چاروں کی نوعیت یہ ہے کہ یہ دراصل correspondence-theory کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان سب کو ہم باہری دنیا میں دیکھ یا دکھا سکتے ہیں۔ یہی وہ ظاہر پرستی ہے جس پر قرآن مجید ایمان بالغیب کو اولیت دیتا ہے،

وہ یہود کے حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً[7] کے نظریے کو دینیات میں غلط قرار دیتا ہے۔

آپ یہاں یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ سائنس تو بعض غیبی چیزوں کو بھی مانتی ہے۔ مثلاً gravity کو کس نے دیکھا ہے۔ لیکن اس کو سب سائنس دان مانتے ہیں۔ اس لیے صرف correspondence-theory کے قائل نہیں بلکہ غیبی امور کو بھی مانتے ہیں۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ سائنس اس نظریے کو مانے گی جو تمام نظام فکر میں فٹ آئے، ٹیسٹ پر پورا اترے اور اس کی بنیاد پر مستقبل کی پیشین گوئی کی جائے اور وہ پوری ہو جائے۔ نظام فکر میں فٹ آنا، ایک نوعیت کی correspondence ہے، ٹیسٹ پر پورے اترنے اور مستقبل میں پیشین گوئی کا پورا ہونا اسی نوع کی چیزیں ہیں۔ ریزن ہماری عقل کو سمجھ آنا، ایسا ہی ہے جیسے ٹیسٹ پر مفروضے کا پورا اترنا۔

گویا اس وقت مغرب پوری طرح اس بات میں الجھا ہوا ہے کہ ہر بات کا شاہد ہونا چاہیے اور یہ شاہد محض چار قسم کے ہیں:

۱- باہر کی دنیا میں موجود ہونا: بذاتِ خود، ٹیسٹ کے نتائج کی صورت میں، پیشگوئی کے پورا ہونے کی صورت میں

۲- ہماری عقل کو سمجھ آنا

۳- مفید اور کارگر ہونا

۴- پورے نظام الفکر میں فٹ آجانا

یہ وہ شواہد ہیں جو مشہود کے ثبوت کے لیے اہلِ مغرب کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔ یہاں مشہود دراصل صرف حواس سے غائب ہے۔ لیکن اس کے اثرات مادے پر نظر آ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کا مصرعہ خوب جچتا ہے کہ (دوسرے مصرعے سے تجرد کے ساتھ)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے[8]

قرآنی نظریۂ علم

آیئے اب ایک نظر قرآن کے نظریہ علم پر ڈال لیتے ہیں۔ بالعموم کانٹ کے نظریہ synthetic-a-priori کو اہل مذہب نے پسند کیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں انسانی وجدان کو مان لیا گیا ہے۔ کانٹ کا خیال ہے کہ نہ دنیا میں محض تجربیت ہے اور نہ محض tautology ہے بلکہ ہم ہر چیز کو اپنے ذاتی علم و تجربے کی روشنی میں سمجھتے ہیں، ہمارا ذہن اپنے تشکیلات ودرجہ بندیوں کو علم پر لاگو کر کے سمجھتا ہے۔ اس لیے خالص حالت میں تجربیت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کانٹ نے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یوں اس نے علم کی دنیا میں یہ بات بتائی کہ تشکیک بے بنیاد تصور ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو کانٹ خود تشکیک کو مضبوط کرتا ہے۔ جب ہر شخص اپنے a priori سے دنیا کو دیکھے گا تو کیا وہ حق پر ہو گا، ظاہر ہے یہ ظن ہے۔ جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ a-priori سب کے ہاں یکساں ہے۔

تعقل کی آفاقیت

ہمارے خیال میں a priori کی کچھ صورتیں سب کے ہاں یکساں اور آفاقی ہیں، خواہ لوگ کسی بھی علاقے میں پیدا ہوئے ہوں اور ان کے تجربات کسی بھی نوعیت کے رہے ہوں۔ میں اخلاقیات سے ایک مثال دے کر بات کو واضح کرنا چاہوں گا۔ سچ اچھائی ہے، اور جھوٹ برائی ہے۔ یہ تصور ایک آفاقی a priori ہے۔ بُرے سے بُرے معاشرے میں جہاں سارا دن جھوٹ بولا جاتا ہو، وہاں بھی پوچھنے پر سچائی ہی کی توصیف ہو گی۔ یہ وہ a priori ہے جس کی بنیاد پر دنیا کا سارا گورکھ دھندا

7- القرآن: آل عمران ۲: ۵۵

8- دیوان غالب: قافیہ ن۔ اس کا دوسرا مصرعہ ہے: ''حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں''۔ یہ ہمارے مضمون سے میل نہیں کھاتا، کیوں کہ اس کا تعلق وحدت الوجود سے ہے۔ ہم نے پہلے مصرعے کو دوسرے مصرعے سے مجرد کر کے استعمال کیا ہے۔

چلتا اور ہر انسان دوسرے انسانوں کے لیے قابل فہم ہے۔ حماقت کی کچھ صورتیں ہر معاشرے میں حماقت ہیں، دانائی کی کچھ باتیں ہر معاشرے میں دانائی ہیں۔ جس طرح بدیہی سچائیاں جیسے 4=2+2 ہر جگہ قائم رہتا ہے، اسی طرح کچھ ذہنی سچائیاں ہیں جو ہر جگہ قائم رہتی ہیں۔ خواہ باہر کی دنیا میں ان کو correspondence ملے یا نہ ملے۔ اس کو لسانی صلاحیت کی مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر تمام انسانوں میں یہ مشترکہ وصف نہ ہو کہ وہ منہ سے نکلنے والی مختلف آوازوں کو پہچان سکیں اور انھیں معنی دے سکیں، تو زبان اور تقریر و تحریر وجود ہی میں نہ آتا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے پاس فہم نام کی ایک چیز پائی جاتی ہے۔ جس کے تحت وہ 4=2+2 کو سمجھ لیتا ہے، چقماق، رگڑنے اور آگ کے تعلق کو پہچان لیتا ہے۔ سیب کے گرنے اور دیگر معلومات کے مجموعے سے کشش ثقل کو تلاش کر لیتا ہے۔

تعقل کی یہ یکسانیت انسانوں نے بہت پہلے ڈھونڈ لی تھی۔ مثلاً یونانی فلسفے کی ساری بنیاد ہی اسی پر قائم رہی۔ یہ آفاقی (universal) تعقل علاقائی روایات و تصورات سے تاریخی، تہذیبی اور علمی و فنی دائرے بھی تشکیل دے لیتا ہے۔ مثلاً عام آدمی کے لیے کسی فلسفی کی یہ تشکیک کہ دنیا موجود نہیں ہے، سرے سے ایک حماقت ہے، مگر فلسفیانہ طرز فکر میں ایک علمی مسئلے کا بیان ہے۔ ذیل کا لطیفہ ہر علاقے کے لیے لطیفہ ہے:

> "ایک فرانسیسی عورت کے گھر میں پانچواں بچہ پیدا ہونے والا تھا، حمل کے دوران میں اس نے اخبار میں ملک چین کی کثرت آبادی کے بارے میں ایک خبر پڑی کہ دنیا کا ہر پانچواں بچہ چینی ہوتا ہے۔ خبر پڑھ کر وہ حیران رہی، شام کو جب اس کا میاں آیا تو اس نے اسے کہا کہ اس دفعہ ہمارے گھر چینی بچہ پیدا ہوگا"۔

لیکن درج ذیل لطیفہ صرف اردو بولنے والے مسلمانوں کے لیے ہی لطیفہ ہے۔ اگرچہ دوسری اقوام کو بھی سمجھایا جاسکتا ہے، لیکن یہ اصلاً علاقائی ہے:

ایک روزہ دار دوسرے سے: یار، کیا سورج ڈوب گیا؟

دوسرا روزے دار بولا: نہیں ڈوبا۔

پہلا روزے دار: لگتا ہے مجھے لے کر ہی ڈوبے گا!

مختصر یہ کہ جس تعقل کی بنا پر ہم ان لطائف کو سمجھتے ہیں، اگر ان میں سے علاقائی عنصر نکال دیا جائے تو یہ تمام اقوام کے لیے یکساں قابل فہم ہوتے۔ لیکن یہ تعقل اس universal-a priori کا محض ایک جزو ہے۔ قرآن اسی یونیورسل a priori کو علم کی بنیاد بناتا ہے۔ اس کو فواد کا نام دیتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ [9]

علمی میدان میں اسلام و مغرب کے اس clash میں یہی پہلی چیز ہے جو مابہ النزاع ہے۔

وحی الٰہی

دوسری چیز نزاع کا موضوع ہے۔ جسے اقبال نے فیضان سماوی سے تعبیر کیا ہے۔ کیا قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے؟ عہد حاضر میں سب سے بڑا چیلنج اسلام کو یہی درپیش ہے۔ قرآن مجید کو وحی ماننا تو در کنار خدا ہی کو منوانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارے اہل علم کو سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قرآن مجید پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں علمی، تاریخی، لسانی اور سائنسی لحاظ سے غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلا انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ ہے جس کا نام 1000+ errors in Quran ہے۔ اس کا جواب دیا جائے۔ میرے مطالعہ کی حد تک ان سب اعتراضات کا شافی جواب دیا جاسکتا ہے۔ میں یہ خوش عقیدگی میں نہیں کہہ رہا، بلکہ مطالعہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

9- القرآن: بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶

الحاد

الحاد تیسری مابہ النزاع چیز ہے۔ جس کا ذکر ہم نے وحی کے تحت کیا ہے۔ قدیم الحاد بڑی حد تک سادہ تھا۔ مگر آج کا الحاد نیچرل ازم، عمرانیات اور فلسفہ کے زیر سایہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو چکا ہے۔ ہم دلائل کے لحاظ سے جتنا بھی بودا کہیں، وہ اپنے نظام العلم میں ٹھوس بنیاد رکھتا ہے۔ مثلا مسئلہ شر (problem of evil) فلسفے میں ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اسی طرح سائنس میں نظریۂ ارتقاء اور بگ بینگ حقائق کی طرح مانے جا رہے ہیں۔ ان کی بنیاد پر نئے نظریات قائم کیے جا رہے ہیں، جیسے یہ کہ کائنات لا شئ سے بنی ہے، اور جس طرح بنی ہے اس میں خدا کی موجودگی ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی خدا کے بغیر اس کی تخلیق اور تدبیرِ امور کی توجیہہ کچھ اس انداز میں کر دی گئی ہے کہ اب ہر علت و معلول کا رشتہ مادے سے شروع ہوتا اور مادے پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عہد قدیم کا ممکن الوجود مادہ اب واجب الوجود بن چکا ہے، وہی خالق ہے، وہی قدیم ہے۔

الحاد کی تشہیر پر مبنی ایک سائن بورڈ

پہلے الحاد کو ماننے والوں کو سوفسطائیت کا طعنہ دے کر رد کر دیا جاتا تھا۔ اب ایسا کرنا ممکن نہیں اس لیے کہ الحاد کو اب سائنس اور ٹکنالوجی کا سہارا حاصل ہے۔ سائنس نے زندگی کے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف لوگوں کا سائنس اور سائنس دانوں پر اس قدر اعتماد پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے عہد میں یہ علم کا سب سے معتمد شعبہ بن چکا ہے۔ دوسری طرف سائنس کی طرف سے اس قدر مذہبی کتابوں میں مسلسل غلطیوں کی نشاندہی پر لوگوں کا مذہب پر اعتماد ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا الحاد ایک مضبوط نظریے کی طور پر سامنے آ رہا ہے۔ اس کو محض برا کہنے یا سوفسطائیت کا نام دے دینے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ علمی میدان میں اتر کر اس کا مقابلہ کیا جائے اور عقل و برہان کے ذریعے سے الحاد کو رد کیا جائے یا مذہب کو ثابت کیا جائے۔ اگر دونوں کام ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔

ملاحدہ کا استدلال

اہل الحاد کے استدلال کے کئی پہلو ہیں۔ جن میں نمایاں مذہبی، تاریخی، عمرانی، فلسفیانہ اور سائنسی بنیادوں پر کئے جانے والے اعتراض ہیں۔ اب ہم ان تمام کو الگ الگ لے کر زیر بحث لاتے ہیں:

مذہبی استدلال

الحاد پرستی نے پچھلی ڈیڑھ دو صدی میں تقریباً تمام مذہبی کتابوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سائنسی بنیادوں پر بہت سی نصوص اور آیات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ مثلاً بائبل کا انسانی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال میں بند کرنا، جبکہ سائنس ساٹھ ہزار سال پرانے انسان کا ثبوت رکھتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید ہی کے بارے میں دیکھیں تو پوری پوری کی ویب سائٹس اس کے لیے موجود ہیں جن میں قرآن کی سائنسی، لسانی، جغرافیائی، تاریخی غلطیاں اور قرآن مجید کے داخلی تضادات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض ملحدین کی طرف سے ہر مذہبی کتاب کو غلط قرار دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ قرآن مجید کو شاید ان میں سب سے زیادہ نشانۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ فرعون نے جادو گروں سے کہا کہ میں تمھیں تصلیب کر دوں گا۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ مصر میں صلیب کا رواج نہیں تھا۔ یا مثلاً یہ کہ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک دن کی لمبائی ایک ہزار سال کے برابر ہے [10]، جبکہ دوسری جگہ خود قرآن ہی ایک دن کو پچاس ہزار سال [11] کے برابر قرار دے دیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے کہ پانچ چیزیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس میں رحم مادر میں بچہ اور بارش کا وقت شامل تھے۔ اب جب سائنس دانوں نے کم از کم ان دونوں کو جاننا شروع کر دیا ہے پہلے مسلمان ان آیتوں کو سادہ معنی میں لیتے تھے اور اب معنی بدل دیے۔ مثلاً رحم مادر میں کیا ہے؟ اس سے مراد وہ یہ لیتے تھے کہ بیٹا یا بیٹی، مگر سائنسی اعتراض کے بعد انھوں نے شقی اور سعید لینا شروع کر دیا، وغیرہ۔ اس عمل سے دراصل الحاد پرستوں نے مذہب کی بنیادیں ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا تو وہ ذات ہے، جس سے غلطی سرزد نہیں ہوتی اور اس کا علم کامل ہوتا ہے۔ جب ان کتب میں غلطی پائی گئی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اللہ کی کتابیں نہیں ہیں۔ جب تمام کتب جن کے الہامی ہونے کا دعوی تھا، غلطیوں سے بھری ہوئی پائی گئیں، تو یہ بات ملحدین کی حد تک پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اللہ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اللہ ہوتا تو ان کتب میں ایسی واضح غلطیاں نہ ہوتیں۔

(أعوذ باللہ أن أکون من الجاھلین)

10- قرآن مجید ۳۲: ۵، يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ

11- قرآن مجید ۷۰: ۴، تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ

تمام اہل مذہب اس چیلنج کی شدت کا صحیح طرح سے ادراک نہیں کر پا رہے۔ بلکہ ایک محض سادہ روی سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہ سب معجزات کا انتظار کر رہے ہیں کہ شاید یہ مصیبت خود ہی ٹل جائے گی، جبکہ ایسا ہونے والا نہیں ہے۔

مذہبی استدلال کا دوسرا پہلو مذہب پرستوں کا اخلاقی اور سماجی زوال ہے۔ اس وقت بدقسمتی سے مسلمانوں سمیت تمام مذہبی اقوام خدا پر ایمان کے باوجود ناکام و نامراد دکھائی دیتی ہیں۔ خود مغرب کے غلبہ کی وجہ عیسائیت کو نہیں، بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور آزادئ فکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ مذاہب بالعموم ان تینوں سے بیر رکھتے ہیں، یا کم از کم ان میں سے بعض کو پسند نہیں کرتے۔ مثلاً اسلام ہی کو دیکھیں تو وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو تو پسند کرتا ہے مگر اس میں مادر پدر آزادئ فکر کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ایک پکا مسلمان بھی ایک ایسے سائنسدان کو قبول نہیں کرے گا، جو غلط قسم کے نظریات کا حامل ہوگا۔ اس عمل کو وہ مذہب کی طرف سے سکھائی ہوئی بُری اخلاقیات قرار دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر مذہب یہی کچھ سکھاتا ہے تو اس کو بہتر ہے نہ مانا جائے۔ ہم دیکھو کتنے اچھے ہیں کہ ہر کسی کو سوچنے، سمجھنے اور جینے کی پوری آزادی دیتے ہیں وغیرہ۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ معجزات اور کرامات اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو اب کیوں نہیں ہوتیں۔ اب تو ہر کام اس طریقے سے ہو رہا ہے، جو سائنس کے مطابق طبعی قوانین کے ماتحت ہونا کہلاتا ہے۔ آج بھی اہل مذہب کو چاہیے کہ وہ جب انہیں بھوک لگے تو خود کھانے کے پاس جانے کے بجائے، کھانے کو اپنے پاس بلائیں۔

تاریخی استدلال

تاریخ انسانی کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مذہب کی وجہ سے انسانوں نے انسانوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے ہیں۔ عہد عتیق سے لے کر بوسنیا اور چیچنیا تک کی تاریخ اس بات پر وہ شاہد بناتے ہیں کہ مذہب ایک خونریزی کی تحریک ہے، جس نے نسلوں کی نسلیں خداؤں کے بھینٹ چڑھادی ہیں۔ اگر مذہب حقیقی خدا یا خداؤں کا دیا ہوا ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا، اور مذہب کی اس بے رحمانہ تاریخ کی روشنی میں ہم اسے کیسے مان لیں۔
اسلامی تاریخ بھی جنگ و جدل سے بھری ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے غزوہ بدر سے لے کر سلطنت عثمانیہ کے آخری دن تک معرکے جاری رکھے ہیں۔ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں ایک رحمدل اور شریف انسان دکھائی دیتے ہیں، مگر مدینہ میں آکر اپنے ہی بھائیوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اور ایک سے زیادہ شادیاں کیں، جو عام بادشاہوں کی طرح کی زندگی لگتی ہے۔ بلکہ مدینہ میں آکر ایک نابالغ بچی سے شادی کی اور غلام بنائے اور انسانیت کی تذلیل کی۔ (اللہ مجھے اس کفر کے نقل کے گناہ سے معاف کرے۔) دیکھیے منٹگمری واٹ کی محمد ایٹ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) (WATT 1956) صفحہ ۳۲۷ اور اس سے آگے۔

عمرانی استدلال

انسانی معاشرے کے مطالعہ سے یہ ثابت کیا جائے کہ مذہب انسانوں کی خود ساختہ چیز ہے۔ اس کی تفصیل وہ یوں کرتے ہیں کہ شروع میں انسان کو جن حالات کا سامنا تھا، وہ کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ جنگل میں ہوتا، سورج کی تیز شعاعیں اس کو جلا کر رکھ دیتیں، آندھیاں طوفان اس کو ادھر ادھر پٹختے، زلزلے اس کو دہشت زدہ کر دیتے، شیر چیتے، اس جیسے آدم زادوں کو نوچ ڈالتے، آسمانی بجلی گرتی اور سب کچھ جلا کر رکھ دیتی، انسان ان چیزوں کے خوف میں مبتلا ہوا، ان کی توجیہہ کرنے لگا، بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یا یہ تمام چیزیں خود صاحب ارادہ ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی صاحب ارادہ ہستی ہے جو ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ توجیہہ کی یہ تمام چیزیں خود صاحبِ ارادہ ہیں، انھوں نے ان سب کو خدا مان لیا، اور جن لوگوں نے ان کے ماورا کسی ہستی کو صاحبِ ارادہ مانا، انھوں نے ان کو تو خدا نہیں مانا مگر غیر مرئی کسی ذات یا کئی ذاتوں کو خدا مان لیا۔ پھر جیسے جیسے انسانوں کے تجربات سے چیزوں کی حقیقت واضح ہوتی گئی، ویسے ویسے خداؤں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ بعض قوموں نے تین، بعض نے دو اور بعض نے ایک خدا کا تصور قائم کر لیا۔ گویا جیسے جیسے انسان کا علم بہتر ہوتا گیا، ویسے ویسے چیزوں کی حقیقت واضح ہوتی گئی اور وہ چیزوں کو خدا سے غیر خدا کی فہرست میں ڈالتا گیا۔ اب انسان کا علم جس جگہ پہنچ گیا ہے، اس نے کائنات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اب اس ارتقاء کا اگلا مرحلہ الحاد ہے۔ یعنی یہ ماننا کہ کوئی خدا موجود نہیں۔ مثلاً Diettrich Bonhoeffer (Capitan 1972) کہتا ہے:

We are proceeding towards a time of no religion at all; men as they are now simply cannot be religious any more. (p 194)

"یعنی ہم ایک لادین وقت کی طرف بڑھ رہے ہیں، آج کا انسان اب مذہبی رہنے والا نہیں ہے"۔

اس استدلال کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے:

پروٹوہیومن سے مکمل انسان بنتے بنتے، انسان کے دل میں اپنے بارے میں درج ذیل سوالات ابھرے:

- موسم کو کون کنٹرول کرتا ہے؟ سورج کو کون لاتا ہے، ستارے کس کی وجہ سے حرکت میں ہیں؟
- یہ طوفان کون لاتا ہے؟ بارش کس کے کہنے پر برستی ہے، قحط کون بھیجتا ہے؟ سیلاب کس کے حکم کے تابع ہیں؟
- زرخیزی کس کے حکم سے قبیلے کی فصلوں اور بھیڑوں اور گائیوں میں برکت دیتی ہے؟
- قبیلے کے نظام کو چلانے کے لیے کیا اصول وضوابط ہوں کہ قبیلہ پرامن طریقے سے رہ سکے؟
- سب سے بڑھ کر یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

سائنس سے پہلے کی دنیا میں یہ سوالات جس قدر اہم تھے اسی قدر ان کے جواب دینے کے لیے کوئی راستہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ موسموں اور طوفانوں کے پیچھے کارفرما اسباب وعلل کو جان ہی نہیں سکتا تھا۔ آج بھی سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود ہم آخری دو سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا جو ان سوالات کے ساتھ آج ہو رہا ہے، وہ باقی تمام کے ساتھ بھی ماضی میں ہوا۔ قبیلے کے بعض طبع آزمالوگوں نے خود اپنے خیال و وہم سے ان سوالات کے جواب دینے شروع کیے۔ یوں پہلا پہلا مذہبی تصور وجود میں آیا ہو گا۔

یہ وہ عمرانی استدلال ہے، جسے اختیار کر کے مذہب کے بارے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ قدیم انسان کے ذہنی وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، تو جس طرح پرانے انسان کی یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ زمین کسی بیل کے سینگ پر نہیں ٹکی ہوئی بلکہ خلا میں تیر رہی ہے۔ اسی طرح مذہب بھی غلط تصور ہے، اس لیے کہ اسے انسان ہی نے تراشا ہے، اور اس کے تراشنے کے لیے کوئی حتمی دلیل یا شاہد اس کے پاس نہیں تھا لہٰذا یہ بھی غلط ہے۔

فلسفیانہ استدلال

اس استدلال کے دو حصے ہیں۔ ایک ان دلائل کا رد جنھیں اہل مذہب فلسفہ کے طرز و اسلوب میں پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ڈیزائن سے ڈیزائنر پر استدلال، سسٹم سے سسٹم بنانے اور چلانے والے پر استدلال۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں فلسفہ ہی کے کچھ سوالات ہیں جن کا جواب دینا ناممکن سمجھا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال problem of evil ہے۔ اس کو فلسفی یوں بیان کرتے ہیں:

مذہب میں یہ مانا جاتا ہے کہ "خدا اچھا ہے"۔ خدا کو اچھا ماننا نہایت مشکل ہے کیوں کہ دنیا میں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ برائی اپنی دونوں صورتوں (یعنی شر اور مصیبت کی صورت) میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر خدا اچھا ہے، اور وہ ہمارا خیال رکھتا ہے، وہ لمحہ لمحہ ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے تو ذیل کی سطور پر غور کریں:

- خدا قادر مطلق ہے۔
- خدا ہر چیز کو جانتا ہے، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ
- خدا اچھا ہے۔

لیکن چونکہ دنیا میں برائی اور مصیبت موجود ہے اس لیے تین میں سے کوئی ایک بات ہو گی۔

- خدا اس برائی اور مصیبت کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔
- اسے پتا ہی نہیں کہ دنیا میں برائی ہو رہی ہے۔
- وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اسے علم بھی ہے لیکن وہ بے نیاز ہے۔

یہ تینوں باتیں خدا کے بارے میں ہمارے تصور سے ٹکراتی ہیں، جو پہلے تین نکات کی صورت میں ہم نے بیان کیں۔ لہٰذا اس بات سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ یا ہمارا خدا کے بارے میں تصور غلط ہے یا خدا ہے ہی نہیں ہے۔

ایک جواب اور اس کا رد

اہل مذہب کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خدا نے یہ سب ہمارے امتحان کے لیے بنایا ہے۔ اس دنیا میں برائی کا وجود ہمارے امتحان کے لیے ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا گیا کہ بچے سے کس بات کا امتحان؟ اس کو اتنی شدید تکالیف سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں اہل مذہب کہتے ہیں کہ اس سے ماں باپ کا امتحان ہوتا ہے۔ فلسفی یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو کوئی اور اچھا طریقہ کیوں نہ مل سکا، کہ والدین کو آزمائے؟ اتنے معصوم کو تکلیف دینے ہی کا راستہ ملا، جبکہ وہ علم و حکمت والا مانا جاتا ہے؟

غرض اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ دنیا مادے کی غیر شعوری حرکات سے اندھے طریقے پر پیدا ہوئی ہے۔ مصیبت اور برائی کی وجہ یہی ہے کہ یہ کائنات کسی ذاتِ حق کے ارادے سے نہیں بلکہ مادے کی اندھی حرکات سے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اتفاق سے کبھی کام اچھا ہو گیا اور کبھی ناقص رہ گیا۔ اس دنیا کا یہ نقص بتا رہا ہے کہ نہ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے نہ خدا ہی موجود ہے۔

سائنسی استدلال

سائنس مذہب کی دشمن نہیں ہے لیکن کچھ فلسفی قسم کے لوگ، اس سے کچھ ایسے نتائج نکال رہے ہیں۔ جو مذہب کو ڈھانے والے ہیں۔

طبعی قوانین کی حاکمیت

سائنس پچھلی چند دہائیوں سے اس بات پر مصر ہے کہ یہ دنیا حکم الٰہی سے نہیں بلکہ طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ مثلاً نمک کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو نمکین کرے گا، اور نمک سوڈے کے ساتھ مل کر جھاگ بنائے گا اور جوش دکھائے گا، جیسے سوڈا واٹر کی بوتل میں نمک ڈالنے سے ہوتا ہے۔ جب بھی سوڈا، پانی اور نمک اکٹھے ہوں گے، یہ ان میں جوش آئے گا۔ خواہ یہ تینوں چیزیں ہوا سے اڑ کر اکھٹی ہو جائیں، یا ایک انسان ایسا کرے۔ غرض یہ کہ سوڈے کے جوش مارنے کے لیے ایک عاقل کی مداخلت ضروری نہیں۔

مادے کے یہ خصائص بگ بینگ کے وقت خود ہی پیدا ہو گئے تھے۔ کیوں کہ جس طرح دھماکا ہوا اور اس میں جس طرح سے ٹھنڈا ہونے پر پہلے مادے کے پارٹیکل بنے اور پھر ان کے بے ترتیب جڑنے پر ایٹم بنے۔ اس سے مختلف النوع مادے بنتے چلے گئے۔ ان کے اندر خود بخود جڑنے کی وجہ سے پروٹان اور نیوٹران اور الیکٹران کی تعداد مختلف تھی، ان کے اختلاف کی وجہ سے مادے کے ذرات کی خصوصیات مختلف ہوتی چلی گئیں۔ ایک سو تین کے قریب مختلف قسم کے مادے وجود میں آ گئے۔ جنھیں ایلیمنٹس یا عناصر کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھی کے باہمی تعامل سے باقی کام ہوتے چلے گئے۔ مادہ ٹھنڈا ہوتا گیا اور اس کے کئی روپ سامنے آتے چلے گئے۔ مختلف درجہ حرارت، مختلف مادوں کی موجودگی، پانی وغیرہ کی موجودگی یہ وہ امور تھے، جن کے مختلف ہونے کی وجہ سے چیزیں بھی مختلف بنتی چلی گئیں۔ غرض Stephen Hawking کے بقول یہ کائنات نہ ہونے سے ہونے میں خود بخود آ گئی، اور چل بھی رہی ہے۔ جس طرح اس کے بننے میں مادے کے خصائص کی کارفرمائی ہے، ویسے ہی اس کے چلنے میں مادے ہی کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً زمین و سورج اور چاند ستاروں کی باہمی کشش اور ان کی قوتِ حرکت جو بگ بینگ کے دھماکے سے وجود میں آئی تھی، اس نظام کے قیام کا ذریعہ ہے جسے سولر سسٹم اور بڑے پیمانے پر کائنات کہتے ہیں۔

زندگی کے اسی مادے کے اندر سے کاربن، نائٹروجن اور بجلی کی قوت سے وہ ابتدائی خلیے بنے جو پروٹین وغیرہ کے بننے میں کام آتے ہیں۔ یوں سمندر کے کسی گوشے میں اچانک زندگی نے جنم لے لیا ہو گا، اور اربوں سالوں کا سفر کر کے وہ مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی انسان کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ جو ابھی تک زندگی کی سب سے ترقی یافتہ صورت ہے۔

ان دونوں کے لیے سائنسدانوں کے پاس بظاہر ناقابلِ تردید شواہد ہیں۔ وہ ان شواہد کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں، جس سے کائنات کا خود بخود پیدا ہونا، اور چلتے رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح fossils کی شکل میں موجود زندگی کی باقیات کو وہ اس ترتیب اور تناظر میں پیش کرتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء ثابت ہو جائے۔

نفسیات سے استدلال

فرائڈ کی نفسیاتی دریافتوں سے لے کر آج تک جو نظریات بھی پیدا ہوئے ہیں، ان میں یہ تصور کافی غلبہ پائے ہوئے ہے کہ انسانوں کے اندر نیکی بدی کا تصور موجود نہیں ہے، بلکہ یہ صدیوں کی اجتماعی زندگی ہے، جس نے کچھ اصولوں کی شکل اختیار کی اور اخلاقیات وجود پذیر ہوئیں۔ یہ کوئی خدائی فیصلہ نہیں ہے، بلکہ سماجی تصور ہے۔ جسے نسل در نسل انسان اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں، یہ بھی اساطیر الاولین ہیں۔ انسان چونکہ سیکھنے والا جانور ہے، لہٰذا اس نے ماں باپ سے اس سبق کو سیکھ کر اپنے مافی الضمیر کا حصہ بنالیا، حالانکہ یہ اس کے ضمیر میں نہیں تھا۔ یہ super-ego ہے، جسے ہمارا سماج ہمیں سکھاتا ہے۔ اس تصور کو مانتے ہی تمام اخلاقیات ٹریفک کے قانون کی طرح سے غیر الٰہی، غیر ضروری اور غیر ابدی قانون بن کر رہ جاتی ہیں۔ جس کی ضرورت صرف ٹریفک کے چلنے کی صورت میں ہے ویسے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کہ اس کے لیے دین کو تخلیق کیا جائے۔

اسی غیر اخلاقی قانون کو پرانے وقتوں میں مذہب کا رنگ دیا گیا تھا۔ اب یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس اخلاق کی حیثیت اب روسو کے معاہدۂ عمرانی سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اسے نہ دین سمجھو، نہ دین کی طرح خیال کرو کہ یہ کوئی اخروی نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ تو محض زندگی گزارنے کا ایک ایسا طریقہ ہے، جس میں انسان باہمی ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

ذرائع علم کا مسئلہ

دورِ حاضر میں ذرائع علم کو مادی تجربیت کے تحت محدود کر دیا گیا ہے۔ ایسے کسی ذریعہ علم کو نہیں مانا جاتا، جس کے بارے میں دوسروں کو قائل کرنا ممکن ہو۔ مثلا وجدان کے تحت اگر کوئی شخص اگر ایک چیز محسوس کر رہا ہے، تو وہ دوسرے کو کیسے بتائے۔ مثلاً سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹے جب ان کے پاس قمیصِ یوسف لے کر آتے ہیں، تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ گویا یوسف آرہے ہیں، تو اس احساس کے تحت وہ فرماتے ہیں کہ (اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ) میں یوسف کی مہک کو محسوس کر رہا ہوں۔ اس کو بعض علما وجدان کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اچھی مثال ہے، مگر اس کو دوسروں کو کیسے منوائیں۔ حضرت یعقوب جیسا بزرگ نبی اور سچا انسان بھی اپنے گھر والوں کو بھی یہ بات نہ منوا سکا۔ لہٰذا وہ بولے: تَاللّٰہِ اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْمِ ، باخدا آپ تو وہ ہی پرانی بھٹکی بات میں پڑے ہوئے ہیں۔ گویا ان کے اہل خانہ نے بھی اس وقت بات مانی ہو گی جب برادران یوسف ان کا کرتہ لے آئے۔

رہا وحی کے بطور ماخذ علم ہونے کا مسئلہ تو ملحدین نے جیسا ہم نے اوپر عرض کیا، الہامی کتب میں اپنے تئیں غلطیاں نکال کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحی کے نام سے پیش کی جانے والی کتب غلطیوں اور تضادات سے بھرپور ہیں، چونکہ خدا غلطی نہیں کر سکتا اس لیے یہ اللہ کی کتب نہیں ہیں۔ چنانچہ نہ خدا ہے، نہ خدا نے وحی کبھی نازل کی ہے۔ اس لیے یہ کوئی ماخذ علم نہیں ہے، اگر یہ کتابیں ماخذ علم ہیں بھی تو ان میں غلطیاں ہیں۔ لہٰذا ان سے یقینی معنی میں سچا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ قرآن مجید فرقان الحمید کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ پرانے انسان کے فہم کے مطابق زمین کے ساکن ہونے اور سورج کے گردش میں ہونے کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں زمین کے چلنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ الحادِ نو اس بات کو پوری قوت کے ساتھ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وحی کے نام سے موجود کتب قابلِ استناد نہیں ہیں۔ بلکہ (نعوذ باللہ) وہ اغلاط وتضادات کا مجموعہ ہیں۔

مذہب کے متبادلات

مذہب کا انکار کر کے ایک خلا پیدا ہوتا ہے لیکن الحاد نے اپنے پرپرزے کچھ اس طرح نکالے ہیں کہ یہ خلا پیدا نہیں ہونے دیا گیا، بلکہ انسانوں کو غیر شعوری طور پر پچھلے دو سو سال سے ایسے نظریات دیے ہیں جو مذہب خلا کو پر کرتے ہیں۔ یوں مذہب کے متبادل کے طور پر انسانی وجود کو سامانِ تشفی فراہم کرتے ہیں۔ ان متبادلات کا فائدہ الحاد کو یہ ہے کہ انسان کی فطرت اگر مذہب کی پیاس محسوس کرے تو اصل پانی پلانے کے بجائے غلط طریقے سے اس کی پیاس بجھا دی جائے، تاکہ وہ مذہب کا مطالبہ نہ کرے۔ اس اصول پر کہ انسان کو جو پیاس اصل میں صحیح مذہب کی ہے، لیکن وہ باطل مذاہب سے بھی اپنی یہ پیاس بجھا لیتا ہے۔ اگر بت پرستی انسان کی دینی پیاس بجھا سکتی ہے تو پھر یہ تازہ افکار بھی انسان کی مذہبی پیاس کو بجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے تحت درج ذیل نظریات کو شمار کیا جا سکتا ہے، جو مذہب کی پیاس کو بجھاتے ہیں، اور ان کے ہوتے ہوئے انسان کسی مذہب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا:

۱۔ قومیت یا وطنیت

ملت کا جو شعور ایک مذہب دیتا ہے، اس کی اگر کوئی چیز متبادل ہو سکتی ہے، تو وہ وطنیت یا قومیت ہے جس کی طرف اقبال نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کا یہ احساس غلط نہیں ہے اس لیے کہ اقبال کے ساٹھ ستر سال بعد اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بہت سے افکار نے مل کر مذہب کے متبادلات فراہم کیے ہیں۔ جن میں سے ایک یہی وطنیت ہے۔ بظاہر حب الوطنی ہر قوم اور ہر نسل کے لیے ایک جذبہ و تحریک کا سامان ہے مگر اس کی لے اگر اتنی بڑھا دی جائے کہ وہ مذہب کی جگہ لے لے تو اس کے معنی کچھ اور ہیں۔

۲۔ معاہدۂ عمرانی اور حقوق انسانی کا چارٹر

دین معاملات میں حقوق و فرائض کی بات کرتا ہے۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت چونکہ الہامی مذاہب ہیں، اس لیے ان میں ان حقوق کا تذکرہ سب مذاہب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی اور اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر جیسی چیزیں دراصل اس ضمانت کا متبادل ہیں، جو مذہب کی طرف سے حاصل ہوتی تھی۔ خدا کی ضمانت کو اقوام متحدہ اور معاہدہ عمرانی کے تحت عوام کے لیے حکومت کی طرف یہ ضمانت دراصل مذہب سے بے نیاز کرتی ہیں۔ جس مقصد کے لیے لوگ مذہب اور آیاتِ الٰہی کا حوالہ دیا کرتے تھے، اب اس کی جگہ اقوام متحدہ کے چارٹر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

۳۔ قانون

تمام ادیان اپنے ماننے والوں کے لیے شرائع تشکیل کرتا ہے، تاکہ ان کی روزمرہ کی زندگی منظم ہو اور ان کو حدود و قیود کا پابند کر کے پُرامن انسان بنایا جائے، تاکہ وہ ایک اچھا باپ، شوہر، بھائی، ہمسایہ، افسر، اور حکمران بن سکے۔ اہل مغرب نے ان تمام چیزوں کے حل کے لیے قانون کا سہارا لیا ہے۔ اب باپ اپنے بچوں پر شفقت اس لیے کرے گا — فطری محبت کے ساتھ ساتھ — کہ کہیں قانون اسے گرفت میں نہ لے اور اس کی اولاد اس سے چھین نہ لی جائے، اور بیٹا اب دین کی تلقین کے مطابق باپ کی ڈانٹ کو نہیں سنے گا، بلکہ وہ اس کے خلاف قانون کا سہارا لے سکے گا۔ تمام آداب و شرائع سے حاصل ہونے والے تحفظ کی جگہ اب قانونی تحفظ کو حاصل ہوگی۔

۴۔ انسانی مرکزیت (humanism)

انسان کے اندر نیکی کا جذبہ فاطرِ ارض و سما نے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ نیکی کو پسند کرتا اور برائی سے اصلاً نفرت کرتا ہے۔ انسان اپنی اس فطری اپچ کی تسکین کئی طریقوں سے کرتا ہے۔ اسلام نے اس کے لیے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک متوازن نظام دیا ہے۔ لیکن اب تمام نیکی کو ایک ہی نام دیا جا رہا ہے، وہ ہے انسان کا تحفظ و فلاح جس کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر مرکزی حیثیت دی جا رہی ہے۔

۵۔ سوشل ورک

انسانوں کی خدمت ہر مذہب میں موجود رہی ہے۔ بھوکے کو کھلانا، مسافر کی مدد، غریب کی مدد یہ ہمیشہ سے ادیان بالخصوص ادیان ابراہیمی میں پوری آب و تاب سے موجود رہی ہے۔ لیکن انسانوں کے ساتھ اس ہمدردی کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ اور عبادات کا ایک نظام بھی موجود رہا ہے۔ اب سوشل ورک کی اہمیت کو بین الاقوامی سطح پر بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس نیکی کے کرنے کے لحاظ سے یہ ابھی بھی کم اہمیت ہے، لیکن ہم جس پہلو سے بات کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ انسان کے نیکی کے جذبے کی تسکین اب اسی سے کی جائے گی۔ انسانی فطرت کا یہ خاصا ہے کہ وہ غیر متوازن طریقے سے بھی اپنے جذبہ کی تسکین کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر وہ

حقوق العباد پورے کرتا رہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی فطرت اسی پر اتنی مطمئن ہو جائے کہ وہ حقوق اللہ یا عبادتِ خدا کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ اس کی ایک عام مثال ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے کہ بالعموم نماز روزے کا اہتمام کرنے والے سماجی نیکیوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ وہ معاشرتی اصلاحی کاموں میں کم ہی حصہ لیتے ہیں۔ بسا اوقات ان کو اخلاقی میدان میں بھی کمزور پایا گیا ہے۔ اس اصول پر سوشل ورک کرنے والے لوگ اپنے جذبۂ عبادت میں کمزور ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس نیکی کا احساس ان کی دوسری نیکیوں کی پیاس کے لیے پانی کا کام کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا NGOs دراصل معابد کی جگہ لیتی جا رہی ہیں، اور سوشل ورک عبادت کی۔

۶۔ سیاسی جدوجہد

انسانی حقوق کی جنگ کے میدان میں جو جدوجہد سیاسی میدان میں کی جاتی ہے، یا انقلابی نوجوانوں کی جدوجہد بھی سوشل ورک کی طرح عبادت کے جذبے کی تسکین بھی کرتی ہے۔

۷۔ نواصنام پرستی neo-paganism

نواصنام پرستی کا مظاہرہ

انسان کی فطری تشکیل کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ غیبی چیزوں کو مانتا ہے۔ لوگ اسی فطرت کی بنا پر توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بھوت پریت، جادو، اور غیبی قوتوں اور ان پر قابو پانا وغیرہ اسی فطرت سے پیدا ہونے والے باطل امور ہیں۔ اسی سے لوک اور مذہبی داستانیں وجود میں آتی تھیں۔ انسان کا یہی وہ رخ ہے جو (mythology) کو وجود پذیر کرتا ہے۔ لیکن انسان کی یہی فطرت ہے جس کی وجہ سے وہ عقیدہ کو ماننے کے قابل ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کی یہ فطرت بھی باطل امور پر یقین رکھ کر مطمئن ہو جاتی رہی ہے۔ بلکہ لگتا یہی ہے کہ عجوبہ قسم کی باتوں سے اس کی اس فطرت کی تسکین زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ اور یورپ میں ایسا ادب تخلیق کیا جا رہا ہے، جو ان چیزوں کو mythology بتائے بغیر انسان کی اس عجوبہ پسندی کی تسکین کرے گا۔ اس مقصد کے لیے فلمیں، ناول، ڈرامے وغیرہ تیار کیے جا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ قدیم زمانے کے باطل خداؤں کو دوبارہ نئی صورتوں میں سامنے لایا جا رہا ہے۔

یہ ایک مختصر فہرست ہے، جس میں بہت سی باتیں یقیناً اور بھی ہوں گی۔ جو انھی متبادلات کا کردار ادا کرتی ہوں گی۔ لیکن ہم یہاں اسی بات پر اکتفا کریں گے کہ انھیں بطور مثال سمجھا جائے کہ کس طرح کی چیزیں انسان کو مذہب کی ضرورت سے بے نیاز کرتی ہیں۔

ہماری ذمہ داریاں

- مضمون پہلے ہی طوالت کا شکار ہو چکا ہے۔ اس لیے ذمہ داریوں کو ہم نکات کی صورت میں بیان کریں گے:
- ہمیں اپنے علمی نظریات کو objectively بیان کرنا ہے، یعنی اس طرح سے بیان کرنا ہے کہ یونیورسل تعقل اسے سمجھ سکے۔
- ہمیں خدا کے ثبوت کے لیے قرآنی طرز استدلال کو دریافت کرنا ہے اور اسے correspondence ذہنیت کے لیے قابل فہم بنانا ہے۔
- ہمیں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب دینے ہیں اور دیتے چلے جانا ہے۔
- ابھی تک جتنے جواب دیے گئے ہیں، ان کا محاکمہ کر کے مضبوط جوابات کو یکجا کر کے قابلِ رسائی بنانا ہے۔

مغرب سے علمی میدان میں توافق کی صورتیں

- تصور علم، الحاد اور استشراق کو چھوڑ کر باقی علمی میدان میں ہمیں مغرب سے کوئی چپقلش نہیں۔
- سائنس کی دنیوی خدمات کے ہم معترف ہیں۔
- تحقیقی دنیا میں آزادانہ مگر دیانت دارانہ طرز فکر کے ہم معترف ہیں۔
- کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ڈیٹا بیس سافٹ ویئر کی فراہمی کے ہم معترف ہیں۔ جس نے تلاشِ مواد کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

- پیور سائنسز کے ساتھ ساتھ سوشل سائنسز میں اختلافات کے باوجود ان کی فتوحات کے ہم معترف ہیں۔
- نظریۂ ارتقاء کے سوا کسی سائنسی نظریے سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔نظریۂ ارتقاء میں اگر انسان کو اس پر پیش نہ کیا جائے تو پھر اسلام کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ماقبل انسان حیوانات میں ارتقاء کے خلاف قرآن و سنت میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے بعض قدیم مفکرین اس ارتقاء کے قائل بھی رہے ہیں۔ وماتوفیقی الا باللہ

Bibliography

- Capitan, William H. "Philosophy of Religion An Introduction." New York: Pegasus, 1972.
- Edward William Lane, "An Account of The Manners and Customs of the Modern Egyptians." London: WILLIAM CLOWES AND SONS, STAMFORD STREET., 1860.
- Hutington, P.Samuel. "The Clash of Civilizations and The Remaking of the World Order." New York: Simon & Schuster Paperback, 1996.
- Steup, Matthias. "An Introduction to Contemporary Epistemology." New Jersey: Prentice-Hall, Inc., 1998.
- WATT, W. MONTGOMERY. "Muhammad at Medina." London: OXFORD, AT THE CLARENDON PRESS, 1956.

اجتماعی اجتہاد اور دورِ حاضر میں اس کی ضرورت

مفتی یاسر احمد زیرک

دارالافتاء، جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر
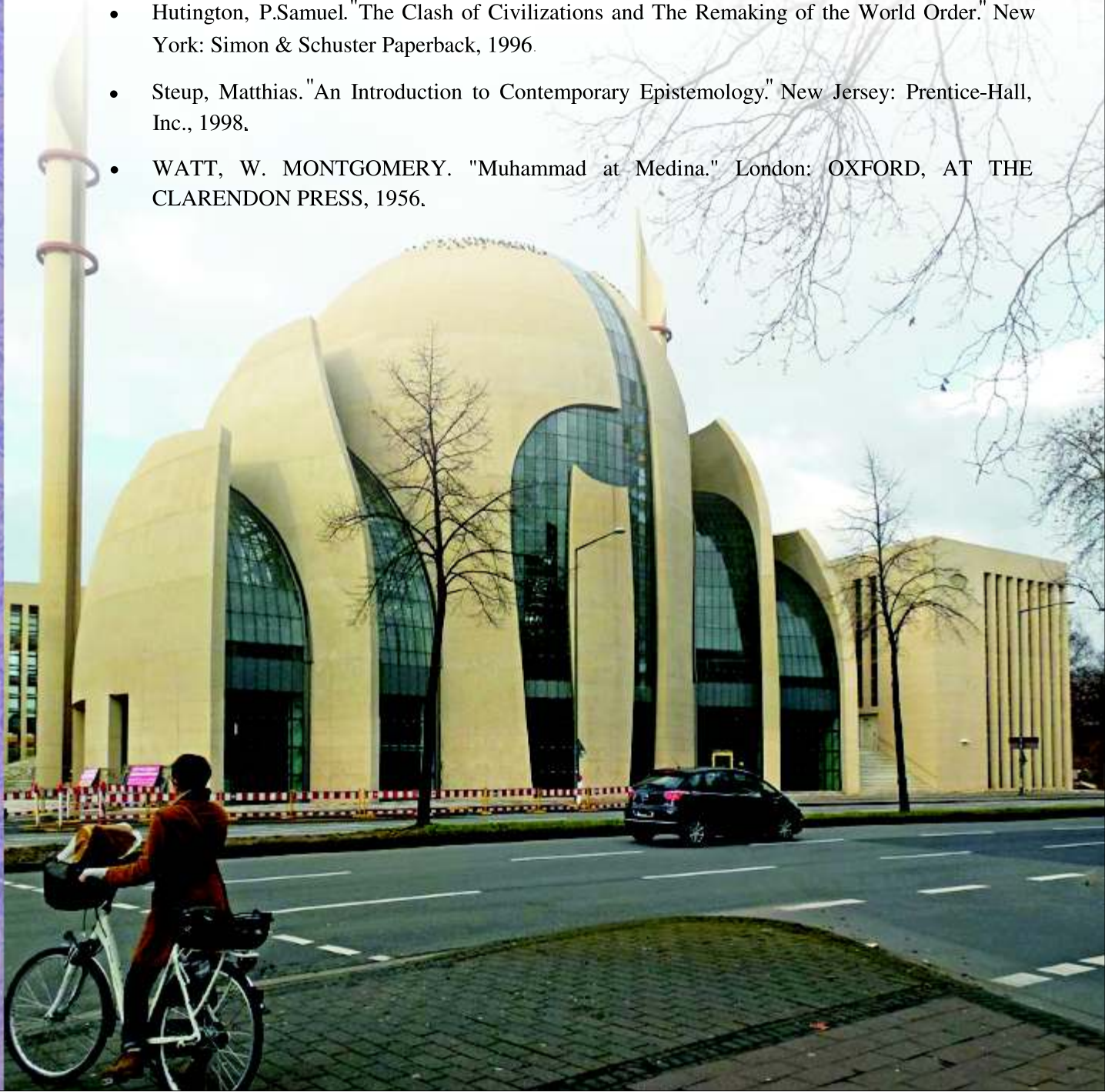
وحی کا سلسلہ حضور نبی کریم ﷺ کی رحلت سے اختتام تک پہنچا، تاہم بموجبِ فرمانِ نبوی ﷺ (ترکت فیکم امرین، لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ نبیہ)(1) فیوضات اور ہدایت کا سلسلہ تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔

دورِ نبوی ﷺ میں چونکہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے جو بھی ارشاد مبارک صادر ہوتا، صحابہ کرامؓ کے ہاں اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا، چنانچہ (وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب:۳۶)) کے مصداق صحابہ کرامؓ سنن ہدی کے علاوہ سننِ عادیہ کی بھی اتباع ضروری سمجھتے تھے۔ اس دور میں فقہ کا مرجع وماخذ براہ راست قرآن وحدیث تھے۔ امتِ مسلمہ کے سوالات واشکالات کے جوابات وحی متلو اور غیر متلو کی صورت میں نازل ہوتے رہے۔

حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی طرف عوام کا رجوع رہا۔ چونکہ حضورِ اقدس ﷺ کی محفل و مجلس کے فیض یافتہ تھے، اس لیے ان کی فقاہت اور دوراندیشی پر اقوامِ عالم کو اعتماد رہا۔ حافظ ابن القیمؒ کے اندازے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب صحابہ کرامؓ فقہاء تھے، جب کہ بعض نے ایک سو تیس لکھے ہیں۔(2)

مختصراً یہ کہ مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے علومِ نبویہ باقاعدہ ایک ایسے مرحلے پر پہنچے جہاں اس سے فقہ ایک الگ علم کی حیثیت سے نکل کر مستقل بنیادوں پر مدون ہوئی۔ ائمہ اربعہ اور ائمہ اصول فقہ نے فقہ اور اصول فقہ کو نئے طریقوں پر استوار کرکے مدون ومرتب کیا۔

موضوع کا تعارف

اجتماعی اجتہاد کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ اور مرتدین کے حکم پر اجماع قائم کیا۔ اسی طرح جدات کے حکم پر بھی اجماع ہوا۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی بہت سارے مسائل میں اجتماعی اجتہاد کو بروئے کار لا کر فیصلے صادر فرمائیں، جیسے طاعون وغیرہ کے معاملے میں۔

دورِ نبوی ﷺ میں بھی صحابہ کرامؓ نے بہت سارے مسائل میں اجتہاد کیا۔ چنانچہ جنگ احزاب کے دن جب صحابہ کرامؓ کو حکم ملا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پڑھنی ہے تو ان میں سے بعض نے اجتہاد کرکے نماز راستے میں پڑھ لی۔ انہوں نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا مقصد جلدی جانا تھا۔ جب کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے نماز مؤخر کرکے رات کے وقت بنی قریظہ میں ادا کی۔(3) اسی طرح حضرت علیؓ کے پاس یمن میں تین آدمی ایک لڑکے کے معاملے میں اپنی خصومت لے آئے۔ ہر ایک اسے اپنا بیٹا قرار دے رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے قرعہ ڈال کر ایک بندے کے حق میں لڑکے کا فیصلہ کر دیا، جب کہ باقی دو آدمیوں کے لیے اسی آدمی سے دو تہائی دیت وصول کر لی۔(4) حضرت علیؓ کے اس فیصلے کی بابت حضور اکرم ﷺ کو جب اطلاع ملی تو آپ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے نواجذ ظاہر ہوگئے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ نے بنی قریظہ کے معاملے میں اجتہاد کرکے فیصلہ صادر فرمایا جس کی باقاعدہ آپ ﷺ نے تصویب فرمائی اور فرمایا (لقد حکمت فیھم بحکم اللہ)۔(5)

الغرض فروعی مسائل میں اجتہاد کا دروازہ تا قیامت کھلا ہے۔جب بھی کسی مجتہد یا فقیہ کے سامنے کوئی انوکھا مسئلہ پیش آجائے اور قرآن وسنت میں اس کا کوئی صریح حکم اسے نہ ملے تو قرآن وحدیث کے مسلم اصولوں کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کے لیے حل نکالنے کی کوشش کریں۔یہی کوشش و سعی فقہاء کی اصطلاح میں اجتہاد کہلاتی ہے۔اسی طرح اگر کئی مجتہدین آپس میں مل بیٹھ کر کسی چیز کا حکمِ شرعی جاننے کے لیے تگ ودو کرکے کوئی فیصلہ فرمائیں، تو ان کا یہ عمل اجتماعی اجتہاد کہلائے گا، جو دراصل ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

اجتہاد کی لغوی و اصطلاحی تحقیق

اجتہاد عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ باب اِفتعال کا مصدر ہے۔یہ" جهد" بفتح الجيم اور" جُهد" بضم الجيم سے ماخوذ ہے۔جس کا مطلب ہے"طاقت"۔(6)

علامہ ابن منظور اپنی شہرہ آفاق تصنیف" لسان العرب" میں لکھتے ہیں"الجهد الطاقة"یعنی جہد طاقت ہی کو کہتے ہیں۔(7)
دوسری جگہ لکھتے ہیں

"الاجتهاد والتجاهد:بذل الوسع والمجهود" (8)
یعنی اجتہاد اور تجاھد انتہائی محنت اور کوشش کرنے کو کہا جاتا ہے۔

مسلمان مفکرین کی نادر شبیہ

عبدالمجید السوسوہ الشرقی اپنی کتاب ''الاجتهاد الجماعی فی التشريع الاسلامی'' میں لکھتے ہیں:" الاجتهاد بذل الوسع فی طلب الامر" یعنی کسی کام کے طلب کرنے میں سخت محنت کرنے کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔یہ باب افتعال کا صیغہ ہے اور باب افتعال مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔لہٰذا "اکتسب" کا صیغہ مبالغہ کے لحاظ سے "کسب" پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔لہٰذا لغت میں اجتہاد ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے انتہائی جدوجہد اور محنت کرنے کا نام ہے۔جس کے حصول کے لیے تکلّف اور مشقّت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر کسی چیز کے حصول کے لیے محنت و مشقّت کی ضرورت نہیں ہوتی تو وہاں اجتہاد کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں ہے۔لہٰذا''اجتهد فی حمل حجر الرحی''یعنی "میں بھاری پتھر کے اٹھانے میں محنت کرتا ہوں"تو درست ہے لیکن ''اجتهد فی حمل حصا'' یعنی"میں ایک کنکری اٹھانے میں محنت کرتا ہوں"درست نہیں ہے۔(9)

اصطلاحی تحقیق

اجتہاد کی اصطلاحی تحقیق کرتے ہوئے متقدمین و متاخرین فقہائے کرام اور اصولیین نے اپنے علم وفہم اور زمانے کے اعتبار سے مختلف قسم کی تعریفات اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔چنانچہ

۱۔ علامہ کمال الدین ابن ھمامؒ کے ہاں اجتہاد کی تعریف یہ ہے۔

''وهو ان يبذل جهده فی طلب الظن بحكم شرعی عن هذه الادلة'' (10)

یعنی ادلہ اربعہ میں انتہائی محنت اور فکر کرنے کے بعد ایک ظنی حکمِ شرعی حاصل کرنا اجتہاد ہے۔

صاحب تیسیر التحریر اور ابن امیر الحاج،علامہ ابن ھمامؒ کے حوالے سے اجتہاد کی تعریف کچھ یوں نقل کرتے ہیں:

''بذل الطاقة من الفقيه فی تحصيل حكم شرعی ظنی''(11)
یعنی کسی ظنی شرعی حکم کے حاصل کرنے کے لیے فقیہ کی قوت صرف کرنے کا نام اجتہاد ہے۔

۲۔ علامہ جرجانیؒ لکھتے ہیں:

"استفراغ الفقیہ الوسع لتحصیل ظن بحکم شرعی" (12)

یعنی کسی ظنی شرعی حکم جاننے کے لیے فقیہ کا انتہائی متوجہ ہو کر محنت کرنا اجتہاد ہے۔

عبد المجید السوسوہ الشرفی نے اسی تعریف کو جامع مانع قرار دیتے ہوئے مختار کہا ہے۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں لکھتے ہیں:

"حقیقۃ الاجتہاد علی مایفہم من کلام العلماء استفراغ الجہد فی ادراک الاحکام الشریعۃ الفرعیۃ عن ادلتہا التفصیلیۃ الراجعۃ کلیاتہا الی اربعۃ اقسام الکتاب والسنۃ والاجماع والقیاس۔ ویفہم من ہذا انہ اعم من ان یکون استفراغا فی ادراک حکم ماسبق التکلم فیہ من العلماء السابقین اولا، وافقہم فی ذالک او خالف، ومن ان یکون ذالک باعانۃ البعض فی التنبیہ علی صور المسائل والتنبیہ علی مآخذ الاحکام من الادلۃ التفصیلیۃ او بغیر اعانۃ منہ" (13)

یعنی اجتہاد شریعت کے فروعی احکامات کو ان کے تفصیلی دلائل سے معلوم کرنے میں بھرپور محنت کرنے کا نام ہے۔یہ دلائل چارقسم کے ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔اس سے معلوم ہوا کہ چاہے اس مسئلہ پر گزشتہ علماء نے بھی بحث کی ہو یا نہ کی ہو،اب اجتہاد کرنے والا گزشتہ علماء کی رائے سے اتفاق رکھتا ہو یا اختلاف۔احکام کے مآخذ یعنی دلائل اور مسائل کی صورتوں سے آگہی میں کسی اور نے بھی تعاون کیا ہو یا نہ کیا ہو، بہر صورت یہ کوشش اجتہاد ہے۔

۴۔علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں:

"بذل الوسع فی نیل حکم شرعی عملی بطریق الاستنباط" (14)

استنباط کے طریقے پر کسی عملی حکمِ شرعی حاصل کرنے کے لیے وسعت بھر محنت کرنا۔

مہا سعد نے علامہ شوکانیؒ کی ذکر کردہ تعریف کو سب سے بہترین قرار دیا۔وہ لکھتی ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، غیر ضروری چیزوں سے خالی ہے، جامع مانع ہے، حکمِ مجتہد فیہ کو لفظِ شرعی کے ساتھ مقید کیا۔اس میں استنباط کے قید کااضافہ کیا، کیونکہ اجتہاد نصوص کے ظاہر سے نہیں ہوتا بلکہ استنباط سے ہوتا ہے۔اسی طرح یہ علماء کے اعتراضات سے بھی محفوظ ہے۔(15)

اجتماعی اجتہاد

اجتماعی اجتہاد کی تعریف عبد المجید السوسوہ الشرفی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"الاجتهاد الجماعي هو: استفراغ اغلب الفقهاء الجهد لتحصيل ظن بحكم شرعي بطريق الاستنباط، و اتفاقهم جميعا او اغلبهم على الحكم بعد التشاور"

اکثر فقہا کا استنباط کے ذریعے کسی حکم شرعی کو ظنی طور پر معلوم کرنے اور پھر اس حکم پر باہمی مشاورت کے بعد سب کا یا اکثریت کا متفق ہو جانا اجتماعی اجتہاد کہلاتا ہے۔

تعریف میں اغلب الفقہاء ذکر کرنے سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اجتماعی اجتہاد انفرادی اجتہاد سے مختلف ہے۔اس لیے کہ اجتماعی اجتہاد دراصل مجتہدین کی ایک جماعت کی محنت اور کاوش ہوتی ہے، جب کہ انفرادی اجتہاد ایک مجتہد کی کاوش ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تعریف میں ایک قید "**واتفاقهم جميعا او اغلبهم على الحكم**" ذکر کرکے یہ واضح کیا کہ مجتہدین کی پوری جماعت یا اُن میں سے اکثر ایک بات اور رائے پر متفق ہو جائے تو یہ اجتماعی اجتہاد متصور ہوگا، بصورتِ دیگر یہ ذاتی اور انفرادی رائے ہی متصور کی جائے گی۔

اسی قید کو اگر ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اس سے اجتماعی اجتہاد اور اجماع میں فرق بھی واضح ہو رہا ہے، کیونکہ اجماع میں امتِ محمدی ﷺ کے تمام مجتہدین کا اتفاق ضروری ہوتا ہے، جب کہ اجتماعی اجتہاد میں چند مجتہدین یا اکثر مجتہدین اگر ایک رائے پر متفق ہو جائیں تو یہ بھی کافی ہے۔گویا اگر کسی اجتہادی حکم پر تمام کے تمام مجتہدین متفق ہو گئے تو یہ اجماع کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

اجتماعی اجتہاد کی ذکر کردہ تعریف میں تیسری شرط "بعد التشاور" ذکر کرنے سے یہ واضح ہوا کہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے حاصل شدہ حکم کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذکورہ عمل میں شریک تمام اہلِ علم کا آپس میں آراء کا تبادلہ ہو چکا ہو، کافی غوروخوض اور گفت وشنید اور باہمی مشاورت کے بعد اسی حکم پر ان سب کا اتفاق ہو جائے، تو یہ اجتماعی اجتہاد کہلائے گا۔اگر بالفرض مذکورہ مجتہدین نے آپس میں کوئی مشاورت نہیں کی اور اتفاقی طور سے کسی حکمِ شرعی کے سلسلے میں ان سب کی آراء ایک دوسرے کے موافق رہی تو یہ اجتماعی اجتہاد نہیں ہوگا، بلکہ یہ اجتہاد میں موافقت کہلایا جا سکتا ہے۔اسی طرح اسی

قید سے بھی اجماع اور اجتماعی اجتہاد کا فرق واضح ہو رہا ہے کیونکہ اجماع کے لیے مجتہدین کی کوئی مشاورت ضروری نہیں ہے۔اگر اتفاقی طور سے بھی امتِ مسلمہ کے تمام مجتہدین ایک حکم شرعی پر متفق ہو گئے تو اجماع کہلائے گا، جب کہ اجتماعی اجتہاد کے لیے مجتہدین کی مشاورت شرط ہے۔(16)

اجتماعی اجتہاد کی حجیت

اجتماعی اجتہاد کی حجیت کو دو حوالوں سے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔پہلا حوالہ مجتہد کی طرف نسبت کرنے کا ہے،اس سے مراد یہ ہے کہ مجتہد کا اپنا اجتہاد اس کی ذات کے حق میں حجت ملزمہ ہوتا ہے یعنی اس کے لیے اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے اور کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرنا اس کے لیے قطعاً جائز نہیں ہوتا کیونکہ مجتہد کے لیے کسی دوسرے کی تقلید کرنا جائز نہیں۔(17) ہاں اگر اسے کسی

دوسرے مجتہد کا اجتہاد اپنے اجتہاد کے مقابلے میں راجح اور درست نظر آئے تو یہ پھر اس پر عمل کر سکتا ہے، لیکن یہ پھر بھی تقلید نہیں ہوگی بلکہ یہ اجتہاد جدید کے زمرے میں آئے گا۔

دوسرا حوالہ عام مسلمانوں کی طرف نسبت کرنے کا ہے، یعنی عام مسلمانوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ کسی خاص مجتہد کے اجتہاد پر عمل کریں، بلکہ ان کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک مجتہد کے اجتہاد کو چھوڑ کر کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کو قبول کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجتہد کسی حکم کا استنباط غلبہ ظن کی بنیاد پر کرتا ہے جو کہ نص قطعی ہے اور نہ ہی اجماع کہ اس میں اختلاف کا احتمال ہی نہ رہے۔

مندرجہ بالا تفصیل انفرادی اجتہاد کے سلسلے میں ہے اور اگر ہم اس کی تطبیق اجتماعی اجتہاد پر کریں تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی حجیت انفرادی اجتہاد سے قوی ہے۔ وہاں صرف ایک مجتہد کی رائے ہوتی ہے، جب کہ اجتماعی اجتہاد میں کسی حکم شرعی پر اکثر مجتہدین کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اجتماعی اجتہاد اجماع اصولی کی طرح ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے:

اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ اجماع نہیں کیونکہ اجماع میں تمام مجتہدین کا اتفاق ضروری ہوتا ہے، جب کہ اجتماعی اجتہاد میں تمام مجتہدین کا اتفاق نہیں ہوتا، بلکہ اکثر کی رائے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ حضرات اپنے موقف کے حق میں حضرت ابن عباسؓ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے عول، ربا الفضل اور متعہ جیسے مسائل میں اکثریت کی مخالفت کی۔ اگر اکثر کی رائے حجیت کے لحاظ سے اجماع کی طرح ہوتی تو صحابہ کرامؓ حضرت ابن عباسؓ پر نکیر فرماتے اور انہیں غلطی پر سمجھتے، حالانکہ نفس الامر میں اس طرح نہیں ہے۔ البتہ بعض علماء کی رائے میں اجتماعی اجتہاد حجیت کے سلسلے میں اجماع کی طرح ہے کیونکہ اجماع اکثریت کی رائے سے منعقد ہوتا ہے جیسا کہ امام ابن جریر الطبری، ابو بکر الرازی، ابوالحسن الخیاط اور بعض معتزلہ اس کے قائل ہے۔ امام احمد بن حنبل سے بھی ایک قول اس طرح منقول ہے۔ (18)

دورِ نبوی ﷺ میں اجتہاد

علماء کی ایک جماعت حضور پاک ﷺ کے اجتہاد کی قائل نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صراحت سے ارشاد فرمایا ہے:

> وما ینطق عن الهوی۔ ان هو الا وحی یوحی۔ (النجم:۳،۴)
>
> (اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے)۔ (19)

لیکن جمہور فقہا حضور پاک ﷺ کے اجتہاد کے قائل ہیں۔ امام ابویوسفؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور اکثر اصولیین اس بات کے قائل ہیں کہ حضور پاک ﷺ کو احکام شرعیہ میں بھی اجتہاد کرنے کا حکم تھا۔ (20) یہی رائے قاضی بیضاویؒ اور امام رازیؒ کی بھی ہے۔ (21) امام غزالیؒ نے اسے راجح لکھا ہے۔ (22) احناف کے ہاں حضور پاک ﷺ کا اجتہاد صرف قیاس کے ساتھ خاص ہے۔ علامہ بہاریؒ لکھتے ہیں" ثبت ان النبی ﷺ اجتهد فی الاحکام ،وهو فی حقه قیاس فقط"(23) یعنی نبی کریم ﷺ احکام میں اجتہاد فرماتے تھے اور آپ ﷺ کے حق میں اجتہاد صرف قیاس ہے یعنی قیاس کے ذریعے اجتہاد کرنا۔ امام سرخسیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کو کسی بھی واقعہ میں وحی کے انتظار کرنے کا حکم تھا، اگر پھر بھی وحی نازل نہیں ہوتی تو پھر آپ ﷺ کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہوتی۔ اگر آپ ﷺ سے اجتہاد میں اللہ تعالی کی منشا کے خلاف کوئی کام ہو جاتا

تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو متنبہ فرمادیتے۔ لہٰذا اگر حضور پاک ﷺ نے کسی امر کی بابت اجتہاد فرمایا ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر کوئی تردید نازل نہ ہوئی ہو تو یہ اس اجتہاد کے قطعی ہونے کی علامت ہے۔(24) دراصل اس میں مختار قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ قواعد میں اجتہاد نہیں کرتے تھے، البتہ فروعات میں اجتہاد کرتے تھے، (25) جیسے کہ حضرت عمر کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ارایت لو تمضمضت بماء وانت صائم) (26) یعنی تمہاری کیا رائے ہے کہ اگر تم روزہ کی حالت میں پانی سے کلی کرو؟ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اس سے تو روزہ نہیں ٹوٹتا تو آپ ﷺ نے فرمایا: بوسہ سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ گویا آپ ﷺ نے پینے کی تمہید، منہ میں پانی ڈالنے کے عمل پر جماع کی تمہید بوسہ کو قیاس فرمایا۔(27)

علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: "أول من قام بهذا المنصب الشريف سيد المرسلين" (28) یعنی اس امت کے سب سے پہلے مفتی جناب محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "وشاورهم في الامر" اور ان سے خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔ (29) اسی آیت میں حضور پاک ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا، گویا کہ آپ ﷺ کو اجتہاد کرنے کا حکم ہوا کہ اپنے صحابہ سے مشورہ کر لیا کریں، جب ان کی آراء آپ ﷺ کے سامنے آجائیں تو پھر موقع و مصلحت کے مناسب اجتہاد کر کے مسئلے کا حل نکال لیں۔ یہ عمل اجتماعی اجتہاد کہلاتا ہے جو کہ دراصل ہمارا موضوع بحث ہے۔

اسی طرح امام ابوداودؒ اپنی کتاب سنن ابی داؤد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے حوالے سے روایت نقل کرتے ہیں کہ دو آدمیوں کا میراث کے معاملے میں آپس میں اختلاف ہوا۔ دونوں دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے لیکن گواہ کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ حضور پاک ﷺ نے دونوں کا دعویٰ سنا اور فرمایا کہ میں بھی انسان ہوں اور تم لوگ میرے پاس مقدمہ لے کر آتے ہو۔ ممکن ہے کہ ایک فریق اپنی چرب زبانی سے دوسرے فریق پر غالب آجائے، اور اس کے بیان پر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، حالانکہ حقیقت میں حق اس کو ملنا نہیں تھا، بلکہ اس کے مدمقابل کا حق تھا تو میرے فیصلے کے باوجود اس کو لینا درست نہیں ہے۔ اور اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اسے جہنم کی آگ دے رہا ہوں۔ یہ سن کر دونوں حضرات رونے لگے اور ہر ایک نے دوسرے کے حق میں دست برداری اختیار کر لی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا "انما اقضي بينكم برائي فيما لم ينزل علي فيه" (30) ۔جس امر کے بارے میں کوئی وحی نازل نہیں ہوتی تو میں اپنی رائے سے تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں۔

دور نبوی ﷺ میں اجتماعی اجتہاد کی مثالیں

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دورِ نبوی ﷺ میں انفرادی اور اجتماعی اجتہاد اور استنباط کا سلسلہ جاری رہا۔ خود حضور پاک ﷺ شرعی، انتظامی، معاشرتی، جنگی اور دیگر کئی سارے مسائل میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت کرنے کے بعد اجتہاد کے ذریعے کوئی لائحہ عمل طے کرتے تھے، جو کہ اجتماعی اجتہاد کا ایک نمونہ ہے۔ چنانچہ ایسے امور وواقعات ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

ا: اذان کے بارے میں مشاورت

حضور پاک ﷺ نے جب صحابہ کرامؓ کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ میں نماز باجماعت ادا کرنا شروع کی تو یہ مسئلہ پیش آیا کہ نماز کے اوقات میں لوگوں کو مسجد کی طرف کیسے بلایا جائے۔ اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کی طرف سے مختلف آراء سامنے

آئیں۔امام ابن ماجہ کی روایت کے مطابق بعض صحابہؓ نے بگل بجانے کا مشورہ دیا جسے آپ ﷺ نے یہود کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے ناپسند فرمایا۔ بعض صحابہؓ کی طرف سے ناقوس بجانے کا مشورہ دیا گیا لیکن اسے بھی نصاری کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔اسی رات ایک انصاری صحابی حضرت عبد اللہ بن زیدؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ نے اذان کا طریقہ خواب میں دیکھا۔حضرت عبد اللہ بن زیدؓ نے وہ اذان حضور ﷺ کے سامنے پیش کی تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یہ خواب میں نے بھی دیکھا تھا، لیکن عبداللہ بن زیدؓ مجھ سے سبقت لے گئے۔اسی روایت میں امام زہریؒ کے حوالے سے یہ تذکرہ بھی ہے کہ صبح کی اذان میں "الصلوۃ خیر من النوم" کا اضافہ حضرت بلالؓ نے کیا، جسے نبی کریم ﷺ نے برقرار رکھا۔(31)

قاضی ابو بکر ابن العربی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے اصول فقہ کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ ملتا ہے جو کہ دین کے معاملے میں قیاس اور اجتہاد کے ذریعے کلام کرنا ہے۔نبی ﷺ نے اذان کے سلسلے میں وحی کا انتظار نہیں کیا بلکہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، تاکہ شریعت کے اصول سے کچھ استنباط کر لیں۔(32)

۲: جنگ احزاب کے موقع پر مشاورت
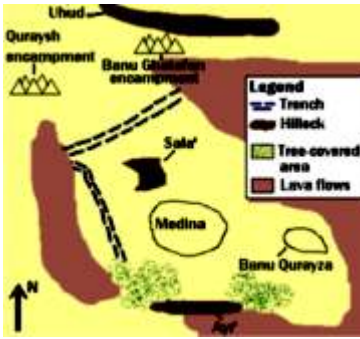
جنگِ احزاب کے موقع پر مدینے کے ارد گرد خندق کھودنا حضرت سلمان فارسیؓ سے مشورہ کرنے کا نتیجہ تھا۔اسی طرح غزوہ احد میں میدان جنگ کے لیے صحابہ کرامؓ سے مشاورت کرنے کے بعد جگہ کا انتخاب کیا گیا۔غزوہ احزاب کے موقع پر جب اہل مدینہ کو انتہائی کٹھن اور ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑا تو نبی کریم ﷺ نے کفارِ عرب کے حوصلے پست کرنے کی خاطر قبیلہ بنو غطفان سے مصالحت کا ارادہ کیا کہ اگر یہ کفار سے الگ ہو جائیں تو ہم انہیں مدینہ کے کھجور کی پیداوار میں سے ایک تہائی دے دیں گے۔ حضورِ پاک ﷺ نے اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ سے مشورہ کیا۔ان حضرات کی آراء سامنے آنے کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے قبیلہ بنو غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جنگ احزاب کا نقشہ

۳: غزوہ حنین کے قیدیوں سے متعلق مشاورت

غزوہ حنین کا مقام

غزوہ حنین کے قیدیوں کو بغیر کسی معاوضے کے آزاد کرنے کے بارے میں بھی حضور پاک ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ دائرہ اسلام میں نئے نئے داخل ہونے والے لوگ اس کے حق میں نہیں تھے، تاہم ان کے قائدین کو آپ ﷺ نے بلایا۔آپس میں غور و فکر کرنے کے بعد سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ قیدیوں کو جلد از جلد بغیر کسی معاوضے کے رہا کر دیا جائے۔چنانچہ تقریباً ۶۰۰ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔(33)

۴: منبر بنوانے کا معاملہ

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں کھجور کے ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ایک دفعہ آپ ﷺ کو منبر بنوانے کا خیال ہوا، چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانوں میں سے اہل الرائے کے ساتھ مشورہ کیا۔انہوں نے بھی مشورہ دیا کہ آپ ﷺ ایک منبر بنوالیں۔آپ ﷺ نے منبر بنوا لیا۔جمعے کے دن جب آپ ﷺ خطبہ دینے کے لیے منبر پر بیٹھنے لگے تو کھجور کے ستون نے رونا شروع کیا جس سے لوگ ڈر گئے۔حضور پاک ﷺ اپنی جگہ سے اٹھے، ستون کے پاس جا کر اسے چھو لیا، جس کے بعد ستون کی آواز رک گئی۔(34)

۵: غزوہ بدر کے موقع پر صحابہ کرام سے مشاورت

غزوہ بدر کا مقام

اسلامی تاریخ میں غزوہ بدر پہلی لڑائی ہے جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان لڑی گئی۔ دراصل ابو سفیان کا قافلہ تجارتی سازوسامان سے لیس ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ تھا۔ حضور پاک ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ سے باہمی مشاورت کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ معاشی طور پر ان کو مفلوج کرنے کی خاطر ان کا راستہ روک دینا چاہئے۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف میں امام مسلمؒ حضرت انس کے حوالے سے یہ روایت کچھ یوں نقل کرتے ہیں:

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاوَرَ حِينَ بَلَغَهُ إِقْبَالُ أَبِى سُفْيَانَ قَالَ فَتَكَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ فَأَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ تَكَلَّمَ عُمَرُ فَأَعْرَضَ عَنْهُ فَقَامَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ فَقَالَ إِيَّانَا تُرِيدُ يَا رَسُولَ اللّٰہِ وَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ لَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نُخِيضَهَا الْبَحْرَ لَأَخَضْنَاهَا وَلَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نَضْرِبَ أَكْبَادَهَا إِلَى بَرْكِ الْغِمَادِ لَفَعَلْنَا قَالَ فَنَدَبَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ فَانْطَلَقُوا حَتَّى نَزَلُوا بَدْرًا۔ (35)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کو جب ابو سفیان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بات کی تو آپ ﷺ نے توجہ نہ فرمائی۔ پھر حضرت عمرؓ نے بات کی مگر آپ ﷺ نے پھر بھی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ حضرت سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا: یقیناً آپؐ ہم ہی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر آپؐ ہمیں حکم کریں کہ ہم اپنے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں کود جائیں تو ہم ضرور بالضرور ایسا ہی کریں گے۔ اور اگر آپ ﷺ ہمیں حکم کریں کہ ہم اپنے گھوڑوں کو "برک غماد" تک دوڑا دیں تو بھی ہم یہ کر گزریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو منتخب کیا، یہاں تک کہ وہ نکلے اور میدان بدر میں اتر گئے۔ (36)

۶: حضرت معاذ بن جبلؓ کی گورنری کا مسئلہ

حضور پاک ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف گورنر بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "لولا انک استشرتنا ماتکلمنا" یعنی اگر آپ ﷺ ہم سے مشورہ طلب نہ بھی کرتے تو پھر بھی ہم کچھ نہیں کہتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "انی فیما لم یوحی الی کأحدکم" یعنی جن مسائل میں وحی نازل نہ ہوتی ہو، ان میں، میں تم جیسے ایک فرد کی طرح ہوں۔ (37)

۷: واقعہ افک اور حضور ﷺ کا طرز عمل

منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی شان میں جب الزام تراشی کی جرأت کی تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ سے ام المومنین کے متعلق جدائی اختیار کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے فرمایا: یا رسول اللہؐ میں تو آپؐ کے اہل وعیال میں خیر کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ جب کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ان کے علاوہ عورتیں بہت ہیں۔ اللہ نے تو اس معاملے میں آپؐ پر کوئی تنگی نہیں رکھی، البتہ آپؐ حضرت بریرہؓ سے پوچھیں، وہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی۔ آپؐ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا، میں نے تو ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں دیکھی، سوائے اس کے کہ وہ بہت چھوٹی ہے۔ گھر کے آٹے سے غافل ہو کر سو جاتی ہے تو بکری آکر اسے کھا لیتی ہے۔ (38)

صحابہ کرامؓ حضور اکرمﷺ کی موجودگی میں اجتہاد نہیں کرتے تھے، البتہ جب آپﷺ سے ایک فرسخ یا کئی فرسخ کے فاصلے پر ہوتے تو پھر اجتہاد کرتے تھے۔حافظ ابن القیمؒ "اعلام الموقعین" میں صحابہ کرامؓ کے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"فتحوا للعلماء باب الاجتهاد، و نهجوا لهم طريقه، و بينوا لهم سبيله"۔ (39)

یعنی صحابہ کرامؓ ہی وہ جماعت ہے جنہوں نے اجتہاد کا دروازہ کھول کر امت کے لیے راستہ ہموار کر لیا۔

دراصل اجتہاد کے سلسلے کا سارا مدار حضرت معاذ بن جبلؓ کی مشہور حدیث ہے جس کی روایت امام ابو داودؒ نے کچھ یوں کی ہے:

عن معاذ ان رسول اللهﷺ لما بعثه الى اليمن قال: كيف تصنع ان عرض لك قضاء؟ قال: اقضى بما فى كتاب الله، قال: فان لم يكن فى كتاب الله؟ قال: فبسنة رسول اللهﷺ قال: فان لم يكن فى سنة رسول اللهﷺ قال: اجتهد رأيى لا آلو، قال: فضرب رسول اللهﷺ صدرى ثم قال: "الحمد لله الذى وفق رسول رسول الله لما يرضى رسول اللهﷺ (40)

گویا کہ یہ حدیث اجتہاد کا منبع ہے تاہم اجتہاد ایسے مسائل میں معتبر ہے جہاں قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہ ہو۔جہاں پر قرآن و سنت میں نظیر موجود ہو، وہاں اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا:

"اذا سمعت عن رسول اللهﷺ حديثا فلا تضرب له الامثال" (41)

یعنی جب آپ کے پاس حضورﷺ کی حدیث پہنچ جائے تو پھر اس کے لیے مثالیں مت بیان کرو۔

الغرض انفرادی اور اجتماعی طور سے باقاعدہ اجتہادات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ محمد الحضری صاحب لکھتے ہیں:

"ان الاجتهاد الجماعى كان منهجا متبعا فى عهد ابى بكر و عمر رضى الله عنهما، و لم ينكر احد من الصحابة، فكان ذالك موافقة منهم على فعلهما" (42)

اجتماعی اجتہاد حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں ایک قابل عمل اصول تھا۔صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی، جو کہ شیخین کے ساتھ اتفاق کی دلیل ہے۔

چنانچہ امام دارمیؒ میمون بن مہران کے حوالے سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"كَانَ أَبُو بَكْرٍ إِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ الْخَصْمُ نَظَرَ فِى كِتَابِ اللَّهِ، فَإِنْ وَجَدَ فِيهِ مَا يَقْضِى بَيْنَهُمْ قَضَى بِهِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِى الْكِتَابِ وَعَلِمَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- فِى ذَلِكَ الأَمْرِ سُنَّةً قَضَى بِهِ، فَإِنْ أَعْيَاهُ خَرَجَ فَسَأَلَ الْمُسْلِمِينَ وَقَالَ: أَتَانِى كَذَا وَكَذَا فَهَلْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- قَضَى فِى ذَلِكَ بِقَضَاءٍ؟ فَرُبَّمَا اجْتَمَعَ إِلَيْهِ النَّفَرُ كُلُّهُمْ يَذْكُرُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- فِيهِ قَضَاءً، فَيَقُولُ أَبُو بَكْرٍ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِى جَعَلَ فِينَا مَنْ يَحْفَظُ عَلَى نَبِيِّنَا. فَإِنْ أَعْيَاهُ أَنْ يَجِدَ فِيهِ سُنَّةً مِنَ النَّبِىِّ -صلى الله عليه وسلم- جَمَعَ رُءُوسَ النَّاسِ وَخِيَارَهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ، فَإِنْ أَجْمَعَ رَأْيُهُمْ عَلَى أَمْرٍ قَضَى بِهِ" (43)

یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو قرآن کریم میں اس کا حل تلاش کر کے فیصلہ کر دیتے۔ اگر قرآن کریم میں انہیں حکم نہ ملتا اور رسول کریم ﷺ کی سنت مبارکہ میں سے کچھ ملتا تو اس پر فیصلہ فرما دیتے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں سے بھی انہیں کچھ نہ ملتا تو مسلمانوں سے پوچھتے کہ میرے پاس یہ یہ مسئلہ آیا ہے۔ کیا آپ میں سے کسی کو اس طرح کے مسئلے میں حضور پاک ﷺ کا کوئی فیصلہ معلوم ہے؟ بعض اوقات کئی سارے افراد جمع ہو کر حضور پاک ﷺ کے کسی فیصلے کا ذکر کر دیتے، تو حضرت ابو بکر فرماتے: تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے ہم میں ایسے افراد پیدا کیے جو ہمارے نبی ﷺ کی باتیں محفوظ کرتے ہیں۔ اور اگر سنت نبوی ﷺ میں بھی کچھ نہیں ملتا تو لوگوں میں سے اہل علم کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کر لیتے، جب وہ سب کسی بات پر متفق ہو جاتے تو اسی پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فیصلہ فرما دیتے۔

اسی طرح علامہ ابن القیمؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے متعلق رقم طراز ہیں:

" وكان عمر اذا لم يجد فى القضية كتابا ولا سنة ولا قضاء من ابى بكر، دعا رءوس المسلمين وعلماء هم فاستشارهم، فاذاا جتمع رأيهم على امر قضى به" (44)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب کسی معاملے میں قرآن کریم یا سنت نبوی ﷺ یا حضرت ابو بکرؓ کے فیصلوں میں سے کوئی فیصلہ نہ ملتا تو پھر مسلمانوں کے بااثر اور صاحب علم افراد کو بلا کر ان سے مشورہ طلب کرتے، تو جب وہ سب کسی بات پر متفق ہو جاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر فیصلہ فرما دیتے۔

مذکورہ روایات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیھم اجمعین کے اجتماعی اجتہاد کے حوالے سے نہایت صریح ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے واقعات اور آثار موجود ہیں جو باقاعدہ صحابہ کرام کے اجتماعی اجتہاد پر دلالت کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند واقعات کا سہارا لیتے ہیں۔

۱: خلیفہ اول کی تقرری

حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت کر کے حضرت ابو بکرؓ صدیق کی تقرری بطور خلیفہ اول کر دی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کا مفہوم ہے کہ: انصار نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر مقرر کرتے ہیں۔ اسی طرح مہاجرین نے کہا کہ امیر ہم میں سے ہو گا۔ بعض انصار حضرات کی طرف سے یہ رائے بھی سامنے آگئی کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک امیر مہاجرین میں سے ہو گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر ہم میں سے ہو گا، لہٰذا حضرت عمر کی بیعت کر لو یا پھر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی بیعت کر لو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نہیں! ہم آپ ہی کی بیعت کریں گے، کیونکہ آپ ہم سب میں سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کے محبوب ہو۔ چنانچہ حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی۔ اس کے بعد دیگر صحابہ کرام نے بھی بیعت کی۔ (45)

۲۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کا مسئلہ

حضور پاک ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بعض مرتد قبائل کی طرف حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ۷۰۰ افراد کا ایک لشکر روانہ کیا۔ جب وہ لشکر وادی ذی خشب تک پہنچ گیا تو حضور پاک ﷺ دنیا سے رحلت کر گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تقرری بطور خلیفہ اول ہوئی۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور اس کے لشکر کو واپس بلایا جائے۔ کیونکہ ایک طرف تو مرتدین کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف مانعین زکوۃ کا فتنہ برپا ہوا، لہٰذا ایسی نازک صورت حال میں ہمیں خارجی

مسائل کے بجائے اپنے اندرونی مسائل کے حل کی طرف توجہ دینی چاہئے تاکہ ہم اندرونی سطح پر عدم استحکام کا شکار نہ ہوں۔ چنانچہ روایت میں حضرت ابو بکر کے ذکر کردہ تاریخی الفاظ ملاحظہ ہوں:

"والذی لا الہ غیرہ، ما رددت جیشا وجھہ رسول اللہ"(46)

ترجمہ: اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اس لشکر کو واپس نہیں بلاؤں گا جسے اللہ کے رسول ﷺ نے بھیجا ہے۔(47)

۳۔ مرتدین کا مسئلہ

حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کئی سارے فتنے رونما ہوئے۔ بعض قبائل زکوۃ کے منکر بن گئے۔ جب کہ بعض لوگ تو مکمل طور سے دین اسلام سے منحرف ہوگئے، جیسے بنی حنیفہ کے لوگ جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کی تصدیق کرکے ان کے پیروکار بن گئے۔ اسی طرح اہل یمن میں سے بعض لوگ اسود عنسی کی نبوت کی تصدیق کر گئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان سے قتال کا ارادہ کیا تو بعض صحابہؓ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ لیکن بالآخر تمام صحابہ کرامؓ مرتدین کے ساتھ قتال کرنے کے معاملے پر متفق ہوگئے۔ (48) یہ روایت امام بخاری کے علاوہ امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداود، امام نسائی اور دیگر بہت سارے رواۃ حدیث نے نقل کی ہے۔

الغرض اس کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں، جن میں باقاعدہ صحابہ کرامؓ نے اجتماعی اجتہاد کرکے مسائل کا حل نکالا، جس میں جمع قرآن کا مسئلہ، (49) اور جنگی امور میں باہمی مشاورت کا مسئلہ (50) قابل ذکر ہیں۔

دور فاروقی میں شراب کی حد کے بارے میں اجتماعی اجتہاد

ابتدائے اسلام میں تدریجی طور سے شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوتا رہا۔ جب مسلمان اس کے ساتھ مانوس ہوگئے تو قطعی طور پر اس کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ اس کے بعد جب کوئی بندہ شراب پینے کی جسارت کرتا تو دربار نبوی ﷺ سے اس کو سزا دینے کے احکامات جاری ہوتے، چنانچہ امام نسائیؒ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"ان الشراب کانوا یضربون فی عھد رسول اللہ ﷺ بالایدی والنعال والعصی حتی توفی رسول اللہ ﷺ" (51)

یعنی شراب پینے والوں کو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہاتھوں، جوتوں اور عصا کے ذریعے مارا جاتا تھا۔

شراب پینے کی کوئی متعین سزا مقرر نہیں تھی، البتہ بعض صحابہ کرامؓ اس کی گنتی کر لیتے تو عموما چالیس کوڑے شمارے میں آتے۔ (52) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہی سزا رائج رہی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت شروع ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ بھی شرابی کو چالیس کوڑے لگاتے رہے۔ تاہم ایک دفعہ ایک شخص کو لایا گیا جو شراب پی چکا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر شراب کی مقررہ حد لگانے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر اس نے قرآن کریم کی ایک آیت

کا غلط سہارا لیتے ہوئے اعتراض کیا۔(53) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ایک شخص جب شراب پیتا ہے تو وہ عقل کھو دیتا ہے اور عقل کھونے پر وہ منہ سے مغلظات نکالتا ہے اور بعض اوقات کسی پر تہمت بھی لگا دیتا ہے، اور تہمت کی سزا چونکہ ۸۰ کوڑے ہے، لہٰذا اس کی سزا بھی ۸۰ کوڑے مقرر کرنی چاہئے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی کو ۸۰ کوڑے لگائے۔(54)

ام الولد کے آزاد قرار دینے کا فیصلہ:

اگر ایک شخص کی لونڈی کے بطن سے اس کا بچہ پیدا ہو جائے تو اس لونڈی کو ام الولد کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالک کی وفات کے بعد ام الولد کے آزاد ہونے یا بدستور ملکیت میں رہ کر میراث کا حصہ بننے کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دونوں کی رائے اس کے آزاد ہونے کے حق میں تھی، لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پر فیصلہ کیا۔ پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اس نے اپنی رائے تبدیل کر کے دوبارہ اس کی لونڈی ہونے کا قول اختیار کیا۔ سنن سعید بن منصور کی روایت مطابق حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> "فرای عمر و علی فی الجماعۃ احب الینا من رای واحد"(55)
> یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجتماعی رائے ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انفرادی رائے سے پسندیدہ ہے۔

ایک مقتول کے بدلے پوری جماعت کے قتل کرنے کا حکم:

قرآن کریم کی آیت "وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین" اور "کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد" سے تو ایک قاتل کا حکم معلوم ہوا کہ اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ لیکن یہ بات مبہم تھی کہ اگر ایک مقتول کے قتل میں

پوری جماعت ملوث ہو، تو کیا پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا یا اس کے متعلق شریعت کا حکم کوئی اور ہے؟ چنانچہ ایک دفعہ یمن میں ایک عورت نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ یمن کے عامل یعلی بن امیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کے متعلق خط لکھا اور اس فیصلے کی بابت امیر المؤمنین کی رائے دریافت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے توقف کیا، پھر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مشورہ طلب کیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> "یا امیر المؤمنین، ارایت لو ان نفرا اشترکوا فی سرقۃ جزور، فاخذ ھذا عضوا و ھذا عضوا، اکنت قاطعھم"(56)
> ترجمہ: اے امیر المؤمنین! اگر کئی افراد مل کر کسی (ذبح شدہ) اونٹنی کی چوری کر لیں، ایک عضو ایک نے لیا، دوسرا دوسرے نے، تو کیا آپ ان سب کے ہاتھ کاٹوں گے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! میں سب کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دوں گا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس مسئلے کو بھی اس پر قیاس کریں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عامل کو لکھا:

> "اقتلھما فلو اشترک فیہ اھل صنعاء کلھم لقتلتھم"(57)
> یعنی دونوں کو قتل کر ڈالو! اگر اس قتل میں پورا صنعا شہر بھی شریک ہوتا تو میں سب کو قتل کر ڈالتا۔

اس کے علاوہ دور فاروقی میں بہت سارے مسائل کا حل اجتماعی اجتہاد کے ذریعے تلاش کیا گیا اور یوں امت مسلمہ کے لیے سہولت کے ساتھ شرعی احکامات واضح کر دیئے گئے، جیسے غیر اقوام کے تجار سے ٹیکس وصول کرنا، (58) مجبور زانی سے حد زنا کا اسقاط (59) اور عدالتی فیصلوں میں اجتماعی اجتہاد سے رہنمائی حاصل کرنے کے سلسلے میں قاضی شریحؒ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط لکھنا وغیرہ وغیرہ۔ (60)

تابعین اور ائمہ اربعہ کے دور میں اجتماعی اجتہاد

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے مبارک دور کے بعد تابعین اور ائمہ اربعہ کا دور شروع ہوا۔ یہ دور علمی اور عملی اعتبار سے واقعۃً خیر القرون کا مصداق رہا۔ دراصل اس جماعت کے سرکردہ افراد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے فیض یافتہ تھے۔ ڈاکٹر تاج عبد الرحمٰن عروسی کے بقول:

> "تابعین کی بڑی تعداد نے صحابہ کرامؓ سے علم حاصل کیا۔ جن میں حضرت سعید بن المسیبؒ سب سے ممتاز اور نمایاں تھے۔ آپؒ کو صحابہ کرامؓ کے زمانے ہی میں فتوی دینے کا شرف حاصل ہے۔ آپؒ کے علاوہ عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبد الرحمٰن المخزومی، خارجہ بن زیدبن ثابت، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سلیمان بن یسار، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود اور علی بن حسین بن علی زین العابدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ علم وفضل کے اعتبار سے اعلی درجے پر فائز افراد اس دور میں موجود تھے۔ (61)

لیکن حافظ محمد زبیر صاحب کے بقول اسی زمانے میں اجتماعی اجتہاد کا عمل فکری و سیاسی اختلافات کی نظر ہو چکا تھا۔

تاہم پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں اجتہادی عمل کو پذیرائی ملی۔ مثلاً:

فقہائے سبعہ کی مجلس مشاورت

مدینہ طیبہ میں جو سات مشہور فقہا تھے، یعنی حضرت سعید بن المسیبؒ، سلیمان بن یسارؒ، سالم بن عبد اللہؒ، قاسم بن محمدؒ، عروہ بن زبیرؒ، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ اور خارجہ بن زیدؒ۔ ان کی باہمی علمی محفل و مجلس منعقد ہوتی تھی۔ چنانچہ حافظ ابن عساکرؒ لکھتے ہیں:

> "وکانوا اذا جائتھم المسئلۃ دخلوا فیہ جمیعاً فنظروا فیھا ولا یقضی القاضی حتی یرفع الیھم فینظرون" (62)
>
> ترجمہ: جب ان لوگوں کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو یہ حضرات اس میں باہمی طور سے غوروفکر کرتے، اور کوئی بھی قاضی کسی (نئے) مسئلے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرتا، جب تک کہ وہ ان کی مجلس میں اس مسئلے کو پیش نہ کر لیتا تھا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا بصرہ کے امیر کے نام خط

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے زمانہ خلافت میں بصرہ کے امیر عدی بن ارطاۃ کے نام خط لکھا کہ تمام قاضیوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ ہر فیصلہ قرآن وسنت کے احکامات کے مطابق صادر فرمائیں۔اگر ایک حکم قرآن و سنت میں نہ ملے تو ہدایت یافتہ ائمہ کے فیصلوں پر فیصلہ کریں۔اگر ائمہ کے فیصلوں میں سے بھی کچھ نہ ملے تو پھر اہلِ علم ورائے سے مشورہ کرکے فیصلہ کر لیا کرو۔(63)

ائمہ اربعہ کے دور میں اجتماعی اجتہاد:

ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے مجتہدین تھے۔ان کی علم وتقویٰ کی شان ہی کچھ ایسی تھی کہ انسانیت کے لیے نمونہ تقلید بن گئے۔یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے فقہ اور اصولِ فقہ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرکے ہفت اقلیم میں متعارف کیا۔قرآن وحدیث سے باقاعدہ اجتہاد و استنباط کرکے احکامات نکالتے رہیں اور امتِ مسلمہ کے لیے ہدایت کی راہ ہموار کرتے جاتے۔ائمہ اربعہ مشہورہ کے علاوہ اور بھی بہت سارے فقہاء تھے جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے تھے اور باقاعدہ اجتہاد کرکے مسائل کا استنباط اور استخراج کرتے تھے۔انفرادی اجتہاد کے علاوہ فقہاء اور مجتہدین کی آپس میں مشاورت بھی ہوتی، جس کے ذریعے مسائل کا حل اجتماعی طور سے نکالا جاتا، مثلا امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ سے ملنے جاتے، علمی مناظرے کرتے، جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک و صاف ہوتے۔(64) اسی طرح اگر ایک امام کو دوسرے امام کا قول اور دلیل قوی محسوس ہوجاتا تو اپنے قول سے رجوع کر لیتے، جیسے صاع کی مقدار کے مسئلے میں امام ابویوسفؒ نے امام مالکؒ کے قول کی طرف رجوع کیا۔(65)

امام ابو حنیفہؒ کا چالیس فقہا پر مشتمل بورڈ کا قیام

بعض تاریخی روایات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے زمانے میں چالیس فقہاء کی ایک مجلس قائم کی ہوئی تھی۔علامہ موفق فرماتے ہیں:

"فوضع ابو حنیفۃ مذھبہ شوری بینھم لم یستمد بنفسہ دونھم" (66)

ترجمہ:امام ابوحنیفہؒ نے اپنا مذہب شورائی رکھا، وہ شرکائے شوریٰ کو چھوڑ کر تنہا اپنی رائے مسلط نہیں کرتے۔

یہ فقہا آپس میں مل بیٹھ کر امتِ مسلمہ کو درپیش فقہی مسائل پر سیر حاصل بحث و مباحثہ کرنے کے بعد حل نکال دیتے۔ علامہ خوارزمیؒ کے بقول تراسی ہزار مسائل کا حل اسی فقہی بورڈ نے نکالا ہے، جس میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے ہیں۔ (67) حضرت امام اعظمؒ کی مجلس میں جو فقہائے کرام شریک ہوتے تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے فن میں ماہر تھا۔ مولانا عبد الحی فرنگی محلؒ کے بقول یہ مجلس مشاہیر علمائے مجتہدین اور فضلائے متقدمین پر مشتمل تھی اور پھر اس مجلس کے ارکان کے نام ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن کا بھی تذکرہ کیا۔ (68) یہی وجہ ہے کہ مشہور محدث وکیع بن الجراحؒ نے فرمایا:

"امام اعظم ابوحنیفہؒ کے کاموں میں غلطیاں کس طرح رہ سکتی تھیں، جب کہ ان کے ساتھ تدوین فقہ اسلامی کے کام میں امام ابویوسفؒ جیسے قیاس واجتہاد کے ماہر، یحییٰ بن زکریا بن زائدہ اور حفص بن غیاص جیسے فن حدیث کے ماہر اور قاسم بن معن جیسے عربیت اور لغت کے ماہر شریک کارتھے۔(69)

اجتماعی اجتہاد اور دور حاضر میں اس کی ضرورت

آج دنیا ایک گلوبل ویلیج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ انتہائی برق رفتاری سے دنیا میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔نئے نئے ایجادات اور ترقیاتی امور کی طرف دنیا گامزن ہے۔ایسی صورت حال میں شرعی احکام اور فقہی مسائل کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔

اگرچہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں فطرتی طور سے انتہائی لچک ہے، جو ہر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کرتے ہیں، تاہم اس ہم آہنگی کے لئے ہر زمانے کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کی جاندار خدمات اور محنتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔جس طرح کہ ماضی کے علماء اور فقہاء کی قابل قدر خدمات اور کاوشیں ہمارے سامنے ہیں۔بلا شبہ اس میدان میں ان کے کار ہائے نمایاں ناقابل فراموش ہیں۔چونکہ انسان کی ضروریات بے شمار ہیں جس کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔اسی وجہ سے قرآن کریم نے حکم دیا:

''فاعتبروا یا اولی الالباب"(سورۃ حشر)
ترجمہ: عبرت حاصل کرو اے بصیرت والو۔

علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فیہ امر بالاعتبار والقیاس فی احکام الحوادث ضرب من الاعتبار فوجب استعمالہ بظاہر الأیۃ"(70)
یعنی اس میں اعتبار کا حکم ہے اور جدید پیش آمدہ مسائل میں قیاس اعتبار ہی کی قسم ہے لہٰذا قیاس کا استعمال ظاہر آیت سے واجب ہوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا کہ جب بھی کوئی معاملہ تمہارے سامنے آئے تو اسے اچھی طرح سمجھ لو۔اس کے بعد لکھا :

"الفہم الفہم فیما یختلج فی صدرک مما لم یبلغک فی القرآن العظیم والسنۃ ثم اعرف الامثال والاشباہ وقس الامور عند ذالک"(71)
یعنی معاملات کے بارے میں قرآن و سنت سے رہنمائی نہ ملے اور وہ تمہارے دل میں کھٹکیں، تو ان پر خوب غور کرو اور فہم سے کام لو، پھر مثالوں اور نظیروں کو معلوم کرو، اس کے بعد قیاس کرو۔

اسی طرح صحابی رسول ﷺ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو علم و فہم کا سر چشمہ تھے۔انہوں نے فرمایا کہ ہم پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ ہمیں قضاء اور فیصلوں سے متعلق کوئی مشکل ہی نہیں تھی، کیونکہ وہ زمانہ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا زمانہ تھا اور تمام مسائل کا حل دربار نبوی ﷺ سے بآسانی مل جاتا تھا۔مولانا سید منت اللہ رحمانی کے بقول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"اب ہمارے لئے راہ عمل یہی ہے کہ ہم کتاب اللہ کو رہنما بنائیں۔اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے تو جناب نبی کریم ﷺ کے فیصلوں کی طرف متوجہ ہوں اور تیسرے نمبر پر صالحین کے فیصلوں سے رہنمائی حاصل کریں اور اگر یہاں بھی مشکل حل نہ ہو تو پھر راہ اجتہاد کی ہے "(72)۔

اسی طرح کا عمل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ لکھتے ہیں:

"کان ستة من اصحاب النبیﷺ یتذاکرون الفقه بینهم علی، ابی، ابو موسی علیحدة، عمر، زید، ابن مسعود علیحدة"(73)

جناب رسول کریمﷺ کے اصحاب میں سے چھ حضرات ایسے تھے جو آپس میں فقہی مسائل پر مذاکرہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، جب کہ حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے۔

بہر حال صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین، تابعین اور تبع تابعین کے انفرادی اور اجتماعی اجتہادات کے حوالے سے تفصیلی بحث ما قبل صفحات کی زینت بن چکی ہے، تاہم ان تمام باتوں کے ذکر کرنے سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اجتہاد بذات خود ایک ایسا عمل ہے جسے کسی بھی زمانے میں نظر انداز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔البتہ جب یہ اجتہاد اجتماعی طور سے ہو تو اس کی تقویت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شکوک و شبہات کے خدشات بھی کم ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی اجتہاد کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے کیونکہ اس کے قائلین کی نظر اس کے ثمرات و نتائج پر ہوتی ہے۔یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے ذخیرہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے اجتہاد ہی ایک راستہ ہے۔دور نبویﷺ سے یہ سلسہ شروع ہے اور انشاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا کیونکہ اس کے بغیر قرآن و حدیث سے نئے نئے مسائل کا حل نکالنا ممکن ہی نہیں۔ (74)

اجتماعی اجتہاد اور عصری ادارے

بلا شبہ اجتماعی اجتہاد ایک ایسی کڑی ہے جو قیامت تک کے آنے والے فقہاء اور اہلِ علم کو پیچیدہ اور غیر منصوص مسائل کے حل کی نسبت سے جڑے ہوئے ہیں۔غرض ہر زمانہ شرعی مسائل کے لحاظ سے پیچیدگیوں اور مشکلات کا شکار ہوجاتا ہے، جس کے حل کے لیے اہلِ علم کے پاس یہی ایک بہترین راستہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے حل نکالا جائے۔چنانچہ حسبِ روایت موجودہ دور میں کئی سارے ادارے ایسے ہیں جو اجتماعی اجتہاد کے عمل کو پذیرائی دے رہے ہیں، جن میں سے چند کا تذکرہ پیشِ خدمت ہے:

مجمع البحوث الاسلامیة قاهرة

یہ ادارہ جامعہ ازہر مصر کا ایک شعبہ ہے۔اس کا کام یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل پیش کرے اور دین اسلام پر مستشرقین اور عیسائیوں کی طرف سے وارد شدہ اعتراضات کا شافی جواب دے تاکہ مسلمان عقیدے کے لحاظ سے تزلزل کا شکار نہ ہوں۔(75) ۱۹۶۱ ء میں اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ شیخ الازہر اس کا سربراہ ہوتا ہے۔(76) ۱۹۶۴ ء میں مجمع کے تحت ایک عالمی اجتماع کا انعقاد ہوا، جس میں مختلف موضوعات جیسے قیاس، اجتہاد اور تلفیق مذاہب وغیرہ پر مقالے پڑھے گئے۔جامعہ ازہر کے معروف عالم دین ڈاکٹر شیخ عبدالحلیم محمود، جو کہ بعد میں شیخ الازہر بھی بنے، نے اجتہاد کی حقیقت کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا۔مولانا منت اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

"اجتہاد طے شدہ اصول کی روشنی میں جدید حالات ومسائل کے شرعی احکام کا انکشاف ہے، کسی نئے حکم کی اختراع نہیں، یہ سابق کی اتباع ہے، نئی ایجاد نہیں۔یعنی اجتہاد کا بنیادی رکن دینی نصوص کی روشنی میں

آنحضورﷺ کے طریقہ کی تحقیق اور نئی پیش آمدہ جزئیات کا حکم دین کے ثابت شدہ اصول کی روشنی میں معلوم کرنا ہے۔اس لیے نہ یہاں کوئی غیر مستند رائے ہے اور نہ کسی نئے اصول کی وضع واختراع۔اسی وجہ سے یہاں کسی ایسی شخصی رائے کی گنجائش نہیں ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت نہ ہو"۔(77)

اہداف و مقاصد

مجمع البحوث الاسلامیہ کے اہداف و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱: اسلامی علوم سے متعلقہ مختلف فروعی مسائل میں ٹھوس تحقیق پیش کرنا۔

۲: اسلامی ثقافت کی تجدید کے لیے سرگرم عمل رہنا اور فضول، لغو اور نقصان دہ چیزوں سے اسے پاک کرنا۔

۳: مذہبی، اجتماعی اور اقتصادی مسائل میں جہاں مشکلات پیش آئیں، وہاں اس کے متعلق اپنی رائے دینا۔

۴: اللہ تعالی کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھے طریقے سے بلانا۔

۵: اسلامی ثقافت کو علمی طور پر بین الاقوامی معیار کے مطابق ہر قسم کے ماحول میں عام کرنا۔

۶: اسلامی علمی وراثت کی تحقیق اور اشاعت۔

۷: جامعہ ازہر کے وفود کو بیرونی دنیا میں بھیجنا اور وہاں سے آنے والے وفود کا جامعہ ازہر سے رابطہ کرانا۔(78)

المجمع الفقہی الاسلامی (مکہ مکرمہ) :

رابطہ عالمی اسلامی نے ذیقعد ۱۳۹۳ ھجری کو مکہ مکرمہ "المجمع الفقہی الاسلامی" قائم کی۔جس کا مقصد آئے روز نت نئے مسائل کا حل اجتماعی اجتہاد کے ذریعے امت کے سامنے پیش کرنا تھا۔(79) اس مجلس کے ممبران سعودی عرب اور دیگر ممالک کے اہل علم اور فقہاء ہیں جو سال میں دس روز مجلس منعقد کرکے مسائل پر بحث وتمحیص کرکے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔(80)

مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

۱۹۸۱ ء میں او۔آئی۔سی کانفرنس کا تیسرا اجلاس سعودی عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں ہوا، جس میں اس ادارے کے قیام کا فیصلہ ہوا۔(81) دنیا کے بہت سارے ممالک کے فقہاء اس کے ارکان ہیں۔وطن عزیز پاکستان سے اس کے رکن شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

قیام کا مقصد

مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اسی ادارے کے ممبران علماء، فقہاء، سائنسدان اور مختلف اسلامی، ثقافتی، معاشی اور سائنسی علوم کے ماہرین ہوں گے تاکہ وقت کی ضرورت کے مطابق پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کریں اور امت مسلمہ کی بروقت رہنمائی کریں۔اسی طرح اس کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ یہ ادارہ شریعت مطہرہ کی اصل روح کو دنیا کے سامنے احسن طریقے سے پیش کرے گا۔(82)

مجمع الفقہ الاسلامی انڈیا

۱۹۸۸ء میں انڈیا کے شہر نئی دہلی میں یہ ادارہ قائم ہوا۔اس کے بانی مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ ہیں۔انہوں نے مرتے دم تک ادارے کی رہنمائی کی۔یہ اکیڈمی ایک تحقیقی ادارہ ہونے کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہے۔ہندوستان سمیت پوری دنیا میں اپنے ممتاز کارناموں کی وجہ عزت کی نگاہ سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔امت مسلمہ میں اس کو ایک معزز مقام حاصل ہے۔یہ ادارہ دوسرے ملکی اور بین الاقوامی اداروں کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار رکھتا ہے۔(83)

مجمع الفقہ الاسلامی انڈیا کے مقاصد واہداف

اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کے اغراض ومقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زندگی کے مختلف شعبہ جات جیسے معاشرتی،سیاسی،معاشی،صنعتی اور ٹیکنالوجی میں انقلابات کے رونما ہونے کی وجہ سے عصر حاضر میں امت مسلمہ کو در پیش مسائل کا حل قرآن و حدیث اور نامور علمائے کرام کی آپس میں بحث وتمحیص اور اجتماعی اجتہاد کے ذریعے نکالنا۔

۲۔ فقہ اور اصول فقہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے موجودہ مسائل اور ماضی کے وہ مسائل جن پر نظرثانی کرنے کی ضرورت ہے،کا حل دریافت کرنا،نیز زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں تحقیقی کام جاری رکھنا۔

۳۔ اسلامی فقہ کے مآخذ،اصول،طریقہ کار اور دیگر نظریات پر تحقیقی منصوبے سر انجام دیتے ہوئے دور حاضر میں عملی جامہ پہنانا۔

۴۔ اسلامی فقہ کی موجودہ دور کے مطابق تشریح کرنا۔

۵۔ فقہی تجاویز،تشریحات اور اسلامی قانون کو جانچنے اور انڈیا سمیت دیگر ممالک میں لاگو کرنے کے سلسلے میں تمام تحقیقی اداروں کے ساتھ امداد باہمی کو فروغ دینا۔

۶۔ اسلامی اصول فقہ سے متعلق مختلف عنوانات کا ایک انڈیکس تیار کرنا۔

۷۔ فقہی تجاویز کو جمع کرنا،نظر ثانی کرنا اور آنے والی نسل کے فائدے کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے شائع کرنا۔

۸۔ سیمینار،بزم کانفرنس اور مطالعاتی ٹیموں کا انعقاد کرنا۔

۹۔ معاشرے میں مختلف طبقات کے اندر اسلامی اصول فقہ سے متعلق رائج غلط فہمیاں اور غلطی پر مبنی تشریحات کی جانچ پڑتال کر کے صحیح اور حقیقی اسلامی نقطہ نظر کو آشکارا کرنا،وغیرہ وغیرہ۔(84)

الغرض اجتماعی اجتہاد کے ذریعے مسائل کے حل کا استنباط واستخراج اور قابل تحقیق مسائل پر تحقیقی مقالے لکھنا اس ادارے کے منجملہ اہم مقاصد میں سے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

اسلامی نظریاتی کونسل کی عمارت

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جو ۱۹۶۲ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۰۴ کے تحت قائم ہوا۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد پارلیمنٹ کے قوانین کی جانچ پڑتال کرنا ہے کہ وہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو یہ ادارہ حکومت کو اس قانون سے متعلق اپنے تحفظات سے آگاہ کرے گا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۲۸ کے تحت اس ادارہ کو منظم کیا گیا۔ آرٹیکل ۲۲۸ کی رو سے اس کے ممبران کی تعداد آٹھ سے کم اور ۲۰ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ممبران کے تقرر کے سلسلے میں سید ذکی عباس لکھتے ہیں کہ:

"ممبران کا تقرر صدرِ پاکستان کی صوابدید پر ہو گا اور وہ ایسے افراد کو نامزد کریں گے جو اسلامی قوانین اور فلسفے کو قرآنِ پاک اور سنت نبوی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام کے تحت سمجھتے ہوں اور انہیں پاکستان کے اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور انتظامی معاملات کے زمینی حقائق کے بارے میں مکمل آگاہی ہو"۔ (85)

کونسل کے ارکان میں سے دو ارکان سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے سابقہ جج ہوں گے، ایک خاتون رکن ہو گی جبکہ کونسل کی ایک تہائی ارکان کم از کم پندرہ سال سے اسلامی تحقیق سے وابستہ ہوں، نیز یہ ارکان تین سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ ان ارکان میں سے ایک رکن چیئرمین مقرر کیا جاتا ہے۔ (86)

اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کا مقصد

انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے پارلیمنٹ کو تجاویز دینا، موجودہ قوانین کو اسلامی احکامات کے تحت لانے کے لئے تجاویز پیش کرنا اور ایسے اقدامات کو مؤثر بنانا، مجلس شوریٰ کی رہنمائی کے لیے ایسے طریقے وضع کرنا کہ جس سے اسلامی احکامات کو قانونی اثر دیا جاسکے، شامل ہیں۔ (87)

اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس کا منظر

اسلامی نظریاتی کونسل کی چند چیدہ چیدہ سفارشات

اسلامی نظریاتی کونسل نے ڈی۔ این۔ اے ٹسٹ کو زنا اور زنا بالجبر جیسے کیسوں میں مرکزی شہادت کے بجائے ضمنی شہادت قرار دیا، جس کی وجہ سے میڈیا، عالمی تنظیموں اور صحافیوں کو زبردست تنقید کا موقع ملا۔ یوں کونسل نے اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کی۔ (88) تاہم حال ہی میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی نے کہا ہے کہ ڈی۔ این۔ اے ایک مفید سائنسی ایجاد ہے، اس سے زنا کا جرم تو ثابت ہو سکتا ہے لیکن زنا بالجبر نہیں۔ اس لیے ڈی۔ این۔ اے کو مرکزی نہیں بلکہ ضمنی شہادت کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ جج زنا بالجبر کے کیس میں دیگر کئی ثبوتوں کے ساتھ ڈی۔ این۔ اے کو بھی سزا کی

بنیاد بنا سکتا ہے۔مولانا شیرانی نے مزید کہا کہ تحفظ حقوق نسواں قانون کی کئی دفعات قرآن و سنت کے منافی ہیں اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ناموس رسالت قانون میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں، جھوٹی ایف آئی آر درج کرنے والے کے خلاف کارروائی کے لیے قوانین پہلے سے موجود ہیں، جو ناموس رسالت کے معاملے میں بھی لاگو ہوتے ہیں۔(89)

کلوننگ، ٹسٹ ٹیوب بے بی، تبدیلی جنس اور کئی سارے غیر شرعی امور اس ادارے نے حکومتی سطح پر حرام قرار دیئے جو یقیناً ایک قابل قدر اقدام ہے۔(90)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پاکستان میں حکومتی سطح پر مشہور و معروف ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل ہے۔یہ ادارہ پاکستانی قوانین کو قرآن و سنت کے ترازو میں تول کر پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو آگاہ کرتا ہے۔جو قانون شریعت مطہرہ سے متصادم ہو، تو اس کے ٹھیک کرنے میں یہ ادارہ حکومت کی رہنمائی کرتا ہے۔(91)

مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ اور بھی کئی سارے ادارے ایسے ہیں جن کی شب وروز محنتوں سے امت مسلمہ فیض یاب ہو رہی ہے۔جیسے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" وغیرہ۔

خلاصہ بحث

اس سے کوئی انکار نہیں کہ موجودہ دور میں امت کو درپیش مسائل کا حل اجتماعی اجتہادات ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔مالیاتی امور میں شریعہ سٹینڈرڈز کا تذکرہ قابلِ ذکر ہے جس کی بدولت آج پوری دنیا میں اسلامی بنیادوں پر بینکاری کا نظام رائج ہے۔جس کی وجہ سے لوگ سود جیسے قبیح گناہ سے محفوظ ہو رہے ہیں۔انشورنس کی لعنت سے چھٹکارا پایا گیا اور اس کے متبادل تکافل کو پروان چڑھایا گیا۔عالم اسلام کے علمائے کرام نے مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے اجلاس میں متفقہ طور سے انشورنس کے مروجہ تمام طریقوں کی حرمت کا فتوی دیا۔اسی اجلاس میں ۱۴۵ ممالک کے ۱۵۰ علمائے کرام شریک تھے۔(92) اسی طرح پگڑی، اعضا کی پیوند کاری، ضبط تولید، جنرل پرائیوڈنٹ فنڈ پر زکوۃ، سود، اور دیگر اہم اور بڑے بڑے مسائل کا حل انہی اداروں کی محنتوں اور برکتوں کی مرہون منت ہے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ فقہائے امت کے لیے تحقیق کی راہیں ہموار کرے اور اس راہ کی تمام رکاوٹیں دور فرمائے۔آمین

حوالہ جات

(1) موطا امام مالک، باب النھی عن القول بالقدر

(2) حافظ ابن القیم، اعلام الموقعین:۱۰،۱۱/۱

(3) امام محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح:۵۹۱/۱

(4) الخطیب البغدادی، الفقیہ والمتفقہ:۱۸۸

(5) امام مسلم، صحیح مسلم ، باب جواز قتال من نقض العھد

(6) عبد المجید السوسوہ الشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ بدولۃ قطر

(7) ابن منظور، لسان العرب:۲۰۸/۶، دارالمعارف،القاہرہ

(8) ایضا ۲۰۹/۶

(9) الغزالی، المستصفی:۳۵۰/۲، امیر بادشاہ، التیسیرالتحریر:۱۷۸/۴،عبد المجید السوسوہ الشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ابن امیر الحاج، التقریر والتحبیر:۲۸۵/۳، الرازی، المحصول:۱۳۶۳/۱۴،الشوکانی، ارشاد الفحول:۷۱۵/۲

(10) کمال الدین ابن ھمام، فتح القدیر:۶/۳۶۲

(11) امیر بادشاہ، التیسیر التحریر:۴/۱۷۹، ابن امیر الحاج، التقریر والتحبیر:۳/۲۹۱

(12) جرجانی، التعریفات، ص:۴

(13) شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص:۶

(14) الشوکانی، ارشاد الفحول:۲/۷۱۵

(15) مہا سعد، الاجتہاد المقاصدی فی عصر الخلفاء الراشدین، ص:۳

(16) عبد المجید السوسوہ الشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی

(17) الغزالی، المستصفی، مسألۃ فی وجوب الاجتہاد علی المجتہد

(18) حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲/۲۳۹,۲۴۰

(19) مفتی محمد تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، ص:۱۱۱۰، مکتبہ معارف القرآن، کراچی

(20) کشف الاسرار:۳/۳۸۶

(21) منہاج الوصول:۲/۹

(22) الغزالی، المستصفی:۲/۳۵۵

(23) البہاری، مسلم الثبوت وشرحہ فواتح الرحموت:۲/۴۰۷

(24) اصول السرخسی:۲/۲۰۸، ایضا کشف الاسرار:۳/۳۸۶

(25) المنخول:۱/۵۸۷

(26) مسند احمد، رقم الحدیث:۱۳۲

(27) شرح الزرقانی علی الموطا:۲/۲۲۱

(28) حافظ ابن القیم، اعلام الموقعین:۱/۱۱، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان

(29) مولانا اشرف علی تھانویؒ، بیان القرآن:۱/۲۹۴، مکتبہ رحمانیہ، لاہور

(30) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، حدیث:۳۱۱۲

(31) امام ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ:۱/۲۳۳، حدیث:۷۰۷ بحوالہ حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲/۲۲۸

(32) القبس شرح الموطا لامام مالک:۱/۱۹۵,۱۹۴ بحوالہ الاجتہاد الجماعی، الدکتور احمد الریسونی، ص: ۵

(33) امام بخاری، الجامع الصحیح، بحوالہ محمد یوسف فاروقی، اجتہاد مناہج واسالیب:۴۴,۴۳

(34) الطبقات الکبری:۱/۲۵۱، بحوالہ حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲/۲۲۸

(35) الصحیح لمسلم، حدیث:۱۷۷۹

(36) شرح النووی علی مسلم:۶/۲۳۴

(37) المعجم الکبیر للطبرانی:۲۰/۶۷، ایضا فتح القدیر:۳/۱۷

(38) امام بخاری، الجامع الصحیح، حدیث: ۳۹۱۰ بحوالہ حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲/۲۳۲

(39) حافظ ابن القیم، اعلام الموقعین:۱/۱۶۶، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان

(40) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد:۲/۱۴۹

(41) امام ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، باب الوضوء مما غیرت النار، ایضا فی مصنف عبد الرزاق وفی مسند الصحابۃ فی الکتب التسعۃ

(42) الشیخ محمد الحضری، تاریخ التشریع الاسلامی، ص:۱۲۸، دارالفکر

(43) ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن الدارمی، سنن الدارمی:۱/۵۲، ایضا اعلام الموقعین:۱/۶۲

(44) اعلام الموقعین:۱/۶۲

(45) امام بخاری، الجامع الصحیح، حدیث: ۳۴۶۷

(46) الاعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد:۳۴۵/۱، حدیث: ۳۲۳

(47) حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲۳۹,۲۴۰/۲

(48) شرح النووی علی مسلم:۹۱/۱

(49) امام بخاری، الجامع الصحیح، حدیث: ۴۷۱۰

(50) المعجم الکبیر، باب ما اسند ابو بکر:۶۳/۱، حدیث:۴۶

(51) امام نسائی، السنن الکبری:۲۵۲/۳

(52) حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲۴۳/۲

(53) سورۃ المائدۃ

(54) ملخص از السنن الکبری للبیہقی:۳۰/۸

(55) سنن سعید بن منصور، کتاب الطلاق:۶۰/۲

(56) الاحکام للآمدی:۴۳/۴، ایضا الاحکام لابن حزم، ایضا اعلام الموقعین، قیاس الصحابۃ فی الجد مع الاخوۃ

(57) الشاطبی، الاعتصام:۱۲۵/۲

(58) مصنف عبد الرزاق، حدیث: ۱۶۸۲۷

(59) السنن الکبری للبیہقی، کتاب القسامۃ:۲۳۶/۸

(60) سنن الدارمی، حدیث: ۱۶۷

(61) الفقہ الاسلامی فی میزان التاریخ، ص: ۱۱۳,۱۱۴

(62) حافظ ابن عساکر، تاریخ دمشق، باب حرف السین:۵۷/۲۰

(63) ابن خلف الوکیع، اخبار القضاۃ:۷۷/۱بحوالہ حافظ محمد زبیر، اجتماعی اجتہاد، ایک تجزیاتی جائزہ:۲۶۰/۲

(64) شیخ ابو زہرہ، امام مالک، ص: ۱۳۷

(65) ایضاً

(66) موفق، مناقب ابی حنیفہ:۱۳۳/۲، بحوالہ قاموس الفقہ: ۳۶۰/۱

(67) ملا علی القاری، مناقب الامام اعظم، ص: ۴۷۳ بحوالہ قاموس الفقہ: ۳۶۰/۱

(68) عمدۃ الرعایۃ، بحوالہ جدید فقہی مباحث: ۳۶/۱، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی

(69) جامع المسانید:۳۳/۱ بحوالہ جدید فقہی مباحث: ۳۶/۱

(70) الجصاص، احکام القرآن بحوالہ جدید فقہی مباحث: ۲۲/۱

(71) بدائع الصنائع بحوالہ جدید فقہی مباحث: ۲۴/۱

(72) مولانا سید منت اللہ رحمانی، خطبہ افتتاحیہ، جدید فقہی مباحث: ۲۵/۱

(73) آثار امام محمد بحوالہ جدید فقہی مباحث: ۳۴/۱

(74) مولانا سید منت اللہ رحمانی، خطبہ افتتاحیہ، جدید فقہی مباحث: ۲۵/۱

(75) http://banuri.edu.pk/ur/node/946

(76) عبد المجید السوسوہ الشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ص: ۱۳۸ وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ بدولۃ قطر

(77) جدید فقہی مباحث: ۲۷/۱

(78) http://www.alazhar-alsharif.gov.eg/item/158/2

(79) عبد المجید السوسوہ الشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ص: ۱۳۹ وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ بدولۃ قطر

(80) الزرقائی، الاجتہاد ودور الفقہ، ص: ۵۲، بحوالہ الاجتهادالجماعی وتطبیقاته، ص: ۱۰۳

(81) http://www.fiqhacademy.org.sa

(82) ایضاً

(83) Report (Islamic Fiqh Academy) page: 5, year:1889-2013, islamic Fiqh Academy India

(84) A Brief Report: Islamic Fiqh Academy, year: 1889-2013,P:5,6

(85) سید ذکی عباس، اسلامی نظریاتی کونسل تعارف، ڈھانچہ اور ذمہ داریاں، ہفت روزہ نوائے اسلام کراچی

(86) ویمن اسلامک لائرز فورم، اسلامی نظریاتی کونسل اور قانون سازی، روزنامہ جسارت کراچی، ۲۴جون ۲۰۱۳

(87) ایضا

(88) urdu-dawn.com/news/124064/cii_review_ruling_on_dna_admissiblity_in_rape_cases

(89) روزنامہ جنگ، ۲۳ستمبر ۲۰۱۳

(90) http://www.islamitimes.org/vdcc14q142bqsx8.c7a2.html

(91) http://en.wikipedia.org/wiki/council_of_islamic_ideology

(92) مفتی محمد تقی عثمانی، فتاوی عثمانی:۳۲۸/۳، مکتبہ معارف القرآن،کراچی

مسانید سیرت اور استحکام پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس ریاست کے نظریہ کا خمیر اسلام سے اٹھایا گیا۔ اسلام ہی پاکستان کی جان، آن اور پہچان ہے۔ اس لیے پاکستان میں اسلام جس قدر معروف، مضبوط اور توانا ہو گا، پاکستان اسی نسبت سے مستحکم اور قوی ہو گا۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کی تمام اکائیوں، قبائل، لسانی گروہوں، خطوں اور علاقوں میں اسلام ہی مشترک قدر ہے۔ یہ دین ہی اس مملکتِ خداداد کو قوتِ نافذہ عطا کرتا ہے اسی لیے وطن عزیز کے طول و عرض میں چپہ چپہ پر اسلامی ادارے، دینی مراکز اور مذہبی عبادت گاہیں قائم اور سرگرم عمل ہیں۔ چنانچہ پورے پاکستان میں مساجد، دینی مدارس، اسلامی مراکز، مزارات اور عبادت گاہوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

اسلام کا بنیادی عنصر کلمہ طیبہ یا کلمہ شہادت دو اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کا پہلا حصہ توحید الٰہی کے عقیدہ کا مظہر ہے اور دوسرا اجزو عقیدہ رسالت کا آئینہ دار ہے۔ عقیدہ توحید تمام الہامی مذاہب کی مشترکہ میراث ہے اور قرآنی تعلیمات کے مطابق یہ توحید تمام اہل کتاب کی متاع بے کراں ہے۔ جبکہ عقیدہ رسالت اسی کا دوسرا جزو ہے۔ نیز توحید الٰہی کی حقیقت اور اس کی اصل ماہیت بھی نبی کے ذریعے سے ہی سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر نبی اپنے خالق کی پوشیدہ حقیقتوں کا پرتو، امین اور داعی ہوتا ہے۔ اس لیے عقیدہ رسالت ایک ایسا عقیدہ ہے، جو ایک جانب تو توحید الٰہی کا مظہر اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عملی اظہار ہے، تو دوسری جانب وہ احکام ربانی کا عملی نمونہ اور امت مسلمہ کی شناخت کا واحد ذریعہ ہے جبکہ حضرت "محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات اور آپؐ کی تعلیمات کے بغیر مسلمان نہ خدا کو حقیقی طور پر پہچان سکتے ہیں نہ اپنی شناخت قائم کر سکتے ہیں اور نہ ہی امت مسلمہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں دل وجان سے محبوب اور اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہیں اور ان کی تعلیمات کو وہ مشعل راہ اور حرز جان بنائے ہوئے ہیں۔

الہامی مذاہب میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے نبیؐ تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے، وہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ ان کی تعلیمات نہ صرف ابدی اور دائمی ہیں، بلکہ وہ قیامت تک تمام زمانوں اور مکانوں کے لیے یکساں مفید اور قابل عمل ہیں۔ نیز وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق و عمل کا پورا نظام ان کی اطاعت، ان کی پیروی اور ان کے اسوہ حسنہ پر کاربند ہونے سے عبارت ہوتا ہے۔ اور ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر ہی امت مسلمہ اپنا وجود، مسلمان اپنا تشخص اور انسان اپنا دین و مذہب انفرادی اور اجتماعی طور پر برقرار رکھ سکتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے دوران ہمارے اسلاف نے یہ نعرہ بلند کیا تھا۔ کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟" جس کے جواب میں برصغیر کی ملت اسلامیہ یک زبان اور بہانگِ دُہل یہ کہتی تھی" لا الہ الا اللہ "جس کا حتمی اور حقیقی مقصد و مدعا یہ ہوتا تھا، کہ نو زائیدہ ریاست پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہو گا۔ یہ امر ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو خارج کر کے دین اسلام کا وجود، تشخص اور کردار قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ کاش تحریک آزادی کے علمبردار اور کارپردازان

اس نعرہ آزادی کے جواب میں لا الہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ "محمد رسول اللہ" بھی کہتے، تاکہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت نہ ہوتا۔ اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا استحکام اور تحفظ وبقاء اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس ریاست کی حکومت، ادارے، عوام اور نظام اپنے آپ کو غلامی رسولؐ کا پابند بنائیں۔

تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستانی قوم نے اسلامی ادارے قائم کیے۔ اسلام کو بطور دین اختیار کیا۔ پاکستان کے دستور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا، ملکی قوانین کو قرآن وسنت کے تابع بنایا۔ ختم نبوت کو مسلمانوں کے عقیدہ رسالت کا جزو لاینفک بنایا۔ سیرت طیبہ اور تعلیمات نبویؐ کو نظام تعلیم میں سمویا نیز اسلامی نظریاتی کونسل، ادارہ تحقیقات اسلامی، وفاقی شرعی عدالت، وزارت مذہبی امور، مرکزی زکوٰۃ انتظامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور اسلامی بنک کاری جیسے عظیم الشان ادارے وقتاً فوقتاً قائم کیے اور انہیں فعال بنایا۔ لیکن اسلام کی جان، دین کی روح، انسانی دکھوں کا مداوا اور انسانی رہنمائی کے عملی نمونہ "سیرت طیبہ" کے گہرے مطالعہ اور ترویج وتحقیق کے لیے پاکستان کے تشکیلی دور میں کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا تھا۔ جس کی اشد ضرورت تھی۔

وزارت مذہبی امور نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہمدرد وقف پاکستان کے تعاون سے ۱۹۷۴ء میں ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا۔ جس میں مشرق ومغرب کے نامور مذہبی سکالر اور عالمی سیرت نگار نے اپنے قیمتی نتائج تحقیق پیش کیے۔ اس عالمی سیرت کانفرنس کے اجلاس وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے علاوہ چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں بھی منعقد ہوئے۔ اس بین الاقوامی کانفرنس کے اختتام پر جو اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں اس امر کی پرزور سفارش کی گئی، کہ پاکستانی جامعات میں مسانید سیرت (seerat chairs) قائم کی جائیں۔ یہ مسانید سیرت نہ صرف پاکستان میں سیرت

مدینہ منورہ کا ایک قدیم منظر

طیبہؐ کی تعلیم وتدریس کا اہتمام کریں، بلکہ یہ سیرت طیبہؐ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیں۔ نیز یہ مسند ہائے سیرت اپنے اپنے دائروں میں سیرت نگاری کی پشت پناہی کریں۔ سیرت کے ادب کو فروغ دیں جبکہ تعلیمی اداروں میں سیرت طیبہؐ اعلیٰ درجوں تک مستقل مضمون (independent subject) کی حیثیت سے بھی متعارف کرائیں۔ گویا سیرت طیبہؐ اور اسوہ حسنہ کو ایک متحرک عنصر کے طور پر مسلم معاشرے میں عام کریں تاکہ اسوہ حسنہ پر عمل کرنا آسان ہو۔

اس سفارش پر عملدرآمد کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے بڑے بڑے پاکستانی تعلیمی اداروں میں مسانید سیرت قائم کیں۔ چنانچہ جامعہ کراچی، جامعہ سندھ، جامعہ بلوچستان، اسلامی یونیورسٹی بہاول پور، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، جامعہ پنجاب لاہور، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور جامعہ پشاور وغیرہ میں مطالعہ سیرت کی مسندیں قائم کیں، جو ابھی تک سرگرم عمل ہیں۔ اپنے دینی شغف اور دینی احکام پُرجوش انداز میں مکمل کرنے والا صوبہ خیبر پختون خوا مطالعہ سیرت میں بھی بازی لے گیا۔ کیونکہ جامعہ پشاور نے صرف مسند سیرت قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس یونیورسٹی نے مطالعہ سیرت کا ایک مستقل مرکز فضیلت (Centre of Excellence) قائم کیا جو ایم فل اور ڈاکٹریٹ تک تعلیمی اور تحقیقی سہولیتں فراہم کرتا ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا ممتاز ادارہ، ادارہ تحقیقات اسلامی بھی مطالعہ سیرت کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کررہا ہے۔ اس ادارے میں مطالعہ

سیرت اور تحقیقی کام کا مرکز ہے جس کا طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے پاس سیرت طیبہؐ پر کتابوں کا ایک وسیع کتب خانہ بھی موجود ہے۔ یہ کتب خانہ تقریباً دس ہزار کتب پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سی نادر کتب اور مخطوطات و مسودات بھی موجود ہیں۔ جو مشرق و مغرب سے لا کر اس جگہ محفوظ کیے گئے ہیں۔ اہل علم کی رائے میں یہ ایک عمدہ کتب خانہ ہے۔ جو سیرت طیبہؐ کے مختلف موضوعات اور متنوع پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے والے ماہرین سیرت کو یک جا بہت سا "سیرت ادب" مہیا کرتا ہے سیرت طیبہؐ کے خدام کے لیے یہ ایک عمدہ سہولت ہے۔

ان مسانید سیرت پر عالمی شہرت یافتہ اور نامور محققین اور اساتذہ کرام دادِ تحقیق دینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جن میں چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ بلکہ بطور نمونہ شامل کی جارہی ہے۔

۱- پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی	۲- پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن	۳- پروفیسر ڈاکٹر نورالدین
۴- پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر	۵- پروفیسر ڈاکٹر شاہین قیصرانی	۶- پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید
۷- جناب خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ	۸- پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز	۹- پروفیسر عبدالجبار شاکر
۱۰- پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام	۱۱- پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت	۱۲- پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید

مسانید سیرت کے سربراہان اور ان کے رفقاء کار کی مہارت، دلچسپی اور شبانہ روز محنت سے نہ صرف یہ مسانید قائم ہوئیں بلکہ ان سب نے سیرت شناسی، مطالعہ سیرت کے فروغ اور اسوہ حسنہ کو عملی سانچے میں ڈھالنے نیز پاکستان میں سیرت طیبہؐ کو ایک مکمل اور مستقل مضمون کے طور پر متعارف کرانے اور فروغ دینے میں انتہائی اہم کردار کیا۔ جس کے پاکستانی معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ پاکستان میں دینی عمل اور اخلاقی قدروں کو فروغ، نیز نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں بھی مدد ملی۔ چنانچہ مسانید سیرت کی خدمات اور اثرات کے چند پہلو یہ ہیں:

صدر ممنون حسین سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

۱- پاکستان کے نظام تعلیم میں "سیرت طیبہؐ" کو شامل کیا گیا۔ چنانچہ تیسری جماعت سے لے کر بی ایس سی پروگرام تک سیرت طیبہؐ کسی نہ کسی انداز میں شامل نصاب ہے۔ جو ایک عمدہ اقدام ہے۔ تاہم اس میں اضافے کی ضرورت ہے۔

۲- سیرت طیبہؐ ایک مستقل مضمون (subject) کے طور پر متعارف ہوئی، جامعہ پشاور میں سیرت طیبہؐ کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹریٹ تک تعلیم و تحقیق کی سہولتوں کو فروغ دیا جارہا ہے۔

۳- سیرت طیبہؐ کے موضوع پر نہ صرف تحقیقی کاوشوں کو فروغ ملا بلکہ نتائج تحقیق کو عام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اس طرح کئی تصانیف زیر طبع سے آراستہ ہوئیں جن میں مسند عائشہ، انسان کامل اور سیرت نگاری کا مجموعہ وغیرہ شامل ہیں۔

۴- سیرت طیبہؐ کے متنوع پہلوؤں اور مختلف موضوعات پر تحاریر تحقیقی مجلات میں بکثرت طبع ہو رہی ہیں۔

۵- جو طلبہ سیرت طیبہؐ کے اہم موضوعات پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں نامور محققین اور اساتذہ کرام سے مدد اور رہنمائی میسر آنے لگی ہے۔

۶۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے مرکز مطالعہ سیرت میں ایک اعلیٰ پایہ کا ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے، جن میں سیرت طیبہؐ کے مضمون پر چھپنے والی کتب وافر تعداد میں یک جا میسر ہیں۔ جن سے محققین استفادہ کرسکتے ہیں۔

۷۔ جامعات کی سطح پر سیرت کانفرنسیں بکثرت منعقدہ کی جاتی ہیں۔ یہ علمی مجالس جامعہ کراچی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، نمل یونیورسٹی، علامہ اقبال یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی وغیرہ میں منعقد کی جاتی ہیں۔ جن سے استفادہ کرکے اعلیٰ تعلیم کے طلبہ اپنا کردار اور اخلاق سنوارتے ہیں۔

۸۔ ان مسانید نے ایسا ماحول قائم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ جس میں اسلامی علوم کے طلبہ عموماً اور سیرت طیبہؐ کے طلبہ خصوصاً عمل تحقیق کو اپنانے اور فروغ دینے کے خوگر بن جاتے ہیں۔ نیز ان میں دینی تعلیمات پر عمل کرنے کو فروغ ملتا اور کردار سازی کو عروج حاصل ہوتا ہے۔

۹۔ بعض مسانید سیرت نے عوام الناس کی رہنمائی کے لیے مواد طبع کر کے عام کیا ہے، جس کے مطالعہ سے تاجروں، طبیبوں، معلمین اور صحافیوں کو فائدہ پہنچا ہے اور سیرت طیبہ کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔

۱۰۔ سیرت طیبہؐ کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے رجحانات میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح سے پاکستان میں قائم مسانید سیرت نے کردار سازی، معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے، نیز پاکستان کو اسلامی، جمہوری، فلاحی اور رفاہی ریاست بننے کی طرف پیش قدمی کی ہے، اس طرح وطن عزیز میں سیرت طیبہ کو فروغ دینے کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوا ہے۔

اس مثبت فعال اور مفید کردار کے باوجود مسانید سیرت کی خدمات اور دائرہ کار محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ یہ مسانید صرف دینی حدود میں کام کر رہی تھیں۔ جبکہ حیات طیبہ، اسوہ حسنہ، احادیث مبارکہ اور اخلاق کریمانہ کی وسعت دینی امور تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور ساری جہات تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان کی پیدائش کے پہلے سے شروع ہو کر مرنے کے بعد انسانی تکفین و تدفین کے بعد تک سیرت طیبہؐ کی رہنمائی اور عمل دخل جاری و ساری رہتا ہے۔ بلکہ سیرت طیبہؐ وہ اکسیر نسخہ ہے، جو انسان کی روحانی و جسمانی، مادی و غیر فانی نیز چھوٹی بڑی بیماریوں کا علاج اور مشکلات کا حل فراہم کرتا ہے۔ اس لیے وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ہم سیرت طیبہؐ کے ایسے مطالعات پیش کریں، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوں، انسانی دکھوں کا مداوا کریں، ہر شعبہ اور طبقۂ فکر کے افراد کو رہنمائی عطا کریں۔ ظاہر ہے کہ انسانی عقل و دانش اور علم و معرفت نیز تجربے و مشاہدے میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتوں اور مسائل میں بھی روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مطالعہ سیرت کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیں اور انسانی مشکلات کا تریاق سیرت نبویؐ سے تلاش کریں۔

یہ بات اس امر کا تقاضا بھی کرتی ہے کہ اس کائنات میں پائے جانے والے تمام علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کر کے انہیں سیرت طیبہؐ کی روشنی میں از سر نو مرتب کیا جائے۔ کیونکہ ہمارا پختہ اور مصمم عقیدہ ہے کہ سیرت طیبہؐ ہمیں ان تمام علوم و فنون کو منتہائے ایزدی کے حصول اور انسانی خدمت کے لیے مثبت انداز میں استعمال کرنے کا پورا موقع، مواد اور راہ مہیا کرتی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہم اپنی کوتاہ نظری، کم علمی

اور محدود فہم کی وجہ سے ان سب امور تک رسائی حاصل نہ کر پائیں۔ جب کہ سیرت طیبہؐ کا دامن وسیع ہے اور وہ جملہ علوم وفنون اور تمام انسانی امور کا احاطہ کرتی ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان ایک طرف تو تطبیقی علوم، تجارتی علوم، بنیادی سائنسی علوم، مالیاتی معاشی علوم، عقلی علوم، سماجی اور معاشرتی علوم نیز اطلاعاتی اور لسانی علوم کو سیرت طیبہؐ کی روشنی میں جانچ پرکھ، چھان پھٹک کر انسانوں کے لیے مزید سود مند بنائیں۔ ہماری اس فکر سے اتفاق کرتے ہوئے وفاقی وزیر محترم ڈاکٹر احسن اقبال نے حال ہی میں اعلیٰ تعلیمی کمیشن (HIGHER EDUCATION COMMISSION) کو تجویز دی ہے کہ سیرت طیبہ کی رہنمائی اور ہدایت سماجی علوم (social sciences) کے لیے عام کریں۔ چنانچہ انہوں نے سماجی علوم کے یہ آٹھ شعبے متعین کیے ہیں جن کا سیرت طیبہؐ کی روشنی میں جائزہ لے کر قابل عمل تجاویز اور سفارشات انسانیت کو فراہم کی جائیں۔ کیونکہ عالمی سطح پر سماجی علوم نہ صرف انسان پر براہ راست اثر انداز ہو کر اس میں مثبت اور مفید تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ یہی علوم انسانی زندگی کے رجحانات (trends) بھی متعین کرتے اور دیگر علوم وفنون کی مفید رہنمائی کرتے ہیں۔ مجوزہ پہلو یہ ہیں۔ جن کا تعلق براہ راست سماجی علوم سے ہے:۔

وفاقی وزیر ڈاکٹر احسن اقبال

۱۔ قیادت اور حکومت ۲۔ عالمی امن ۳۔ انسانی حقوق اور سماجی انصاف

۴۔ کاروبار، تجارت اور حقوق املاک ۵۔ تعلیم و علم ۶۔ پائیدار ترقی

۷۔ سماجی انصاف اور فلاح ۸۔ صنعتی تعلیم اور حقوق نسواں

وفاقی وزیر کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیمی کمیشن (H.E.C) نے ایک قومی کمیٹی تشکیل دی ہے جو وطن عزیز کے ماہرین سیرت طیبہؐ اور ماہرین سماجی علوم پر مشتمل ہے۔ جس نے تجویز کیا ہے، کہ پاکستان کی آٹھ ممتاز جامعات میں سماجی علوم اور مطالعہ سیرت کے شعبے قائم کیے جائیں۔ ہر جامعہ مذکورہ بالا موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر تحقیقی اور تدریسی سرگرمیوں کا ذمہ دار ہے اور ایک ماہر سیرت اور سماجی علوم اس پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار ہو، جس کی طرف پیش رفت جاری ہے۔ جبکہ مسانید سیرت کو نئی قوت، نیا لائحہ عمل اور جدید منصوبوں سے آراستہ کر کے ان کا احیاء کیا جارہا ہے۔ اور انہیں مزید متحرک اور فعال بنایا جارہا ہے۔ جو وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور اپنی جگہ متعلقہ اداروں کا اہم اور مستحسن اقدام بھی ہے۔ تاہم اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سیرت طیبہؐ کو ایک اہم مضمون قرار دے کر اسے انسانی زندگی کے تمام شعبہ اور سب پہلوؤں میں متعارف کرایا جائے۔ نیز سماجی علوم کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی اس کی ہدایت کو عام کیا جائے۔ تاہم ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے، کہ مسانید سیرت اس موضوع کے ان ضروری پہلوؤں پر توجہ دیں، جو نہ صرف ابھی تک گم نامی میں ہیں، بلکہ ان کی تکمیل کر کے ہی ہم ایک جانب سیرت طیبہؐ کو انسانی زندگی کا مکمل حوالہ بنا سکیں گے، تو دوسری جانب ہم ان مسانید کو حقیقی معنوں میں فعال، مستحکم اور نتیجہ خیز بنا سکیں گے۔ نیز پاکستان کو اسلامی جمہوری، رفاہی اور فلاحی ریاست بنانے کے خواب کو حقیقت کا روپ دے سکیں گے۔ اس لیے ہم ایسے نکات کی نشان دہی کرتے ہیں جنھیں اپنانا مسانید سیرت کی وسعت، افادیت اور خدمت کے آئینہ دار ہوں گے، یہ نکات صرف تجاویز ہیں۔ جن پر مزید غور کیا جائے۔

۱۔ خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات کے حوالے سے لاتعداد کتب، تصنیف اور موضوعات آج بھی مسلم محققین کا پسندیدہ موضوع ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی ایک معتبر، مستند اور مصدقہ سوانح حیات ابھی تک میسر نہیں ہے۔ یہ کام امت مسلمہ پر قرض ہے کہ وہ اس محسن انسانیت کو ایک ایسی سوانح حیات مرتب کر کے انسانوں کو فراہم کرے، جو تضادات، اختلافات، مبالغوں، خود ساختہ کہانیوں، قیاس آرائیوں، غیر ضروری اضافوں اور ہر طرح کی زمانی اور ثقافتی ملاوٹوں اور آمیزشوں سے مبرا اور پاک ہو۔ اس میں خالق کون و مکان کے پیدا کردہ افضل ترین انسان کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر واقعہ بالکل واضح اور شفاف اسلوب میں بیان ہو، جس میں کوئی اختلاف یا شک و شبہہ نہ ہو نیز وہ اس طرح سے مکمل ہو کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ ہو۔

جن خوش نصیب اصحاب فکر و دانش نے سیرت طیبہؐ کے اس پہلو پر توجہ دی ہے۔ وہ اس موضوع کی حقیقی اور لاینحل مشکلات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے اس کھٹن اور دشوار کام کی تکمیل انتہائی ضروری ہے۔ یہ کام امت مسلمہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بھی قرض ہے۔ جس کا چکانا پوری امت مسلمہ کے لیے فرض کفایہ ہے۔ پاکستان جس کی تکمیل کر کے امت مسلمہ اور انسانیت کو ایک بہترین تحفہ دے سکتا ہے۔

۲۔ سیرت طیبہؐ بلا شبہہ انسانی زندگی کے تمام اجزاء اور سب پہلوؤں تک وسیع ہے۔ اس لیے یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ محسن انسانیت کی حیات طیبہ، احادیث مبارکہ، اسوہ حسنہ اور اخلاقی اقدار کے اس پہلو کو پوری ذمہ داری، محنت اور جانفشانی سے ادا کریں اور ایک ایسا وسیع تر منصوبہ ترتیب دیں، جس میں انسانی زندگی کے تمام گوشے شامل ہوں۔ اس منصوبہ پر دو طرح سے عمل درآمد کیا جاسکتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ پر ایک الگ کتاب تیار کر کے انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مہیا کی جائے۔ بعد میں ان کتب، مقالات، مضامین اور رشحات قلم کو یک جا جمع کر کے الفبائی ترتیب سے طبع کر دیا جائے۔ اس طرح سیرت طیبہؐ کا ایک دائرہ معارف تیار ہو جائے گا۔ تاہم اس منصوبے کی تکمیل و تنفیذ میں بہت سی عملی مشکلات در پیش ہوں گی۔ اس لیے دوسرا طریقہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ آغاز کار سے ہی سیرت طیبہ کے دائرہ معارف کا منصوبہ تشکیل دیا جائے۔ اور ابتداء ہی سے اسے زیادہ سے زیادہ وسیع اور جامع بنایا جائے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کے مختلف اجزاء کی تدوین و تصنیف بیک وقت

اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس دائرہ معارف سیرت، کا سارا کام آٹھ شعبوں میں تقسیم کر کے مختلف جامعات میں حسب ضرورت تقسیم کر دیا جائے اور اس کی تکمیل کے مراحل اور اہداف متعین کر کے جامعات کو اس کی تکمیل کا پابند بنایا جائے۔ اس طرح یہ کام قلیل مدت میں مکمل ہو سکتا ہے۔

۳۔ جدید مصادر کی دستیابی، رواۃ کی تعداد کا تعین، کمپیوٹر کا عام استعمال اور تربیت یافتہ وافر بشری قوت موجود ہونا چند ایسے عوامل ہیں جو نہ صرف سیرت نگاری میں انتہائی مفید اور ممد و معاون ہیں بلکہ وہ نگاری پر قابو پانے میں بھی یادگار اور مددگار ثابت ہوں گے۔ اس لیے مسانید سیرت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ" سیرت نگاری کا منہج" متفقہ طور پر تشکیل دیں۔ اس کے مطابق سیرت نگاروں کی تربیت کریں اور بعد ازاں وہ سیرت طیبہؐ کے رواۃ، سیرت طیبہؐ کے پورے مواد اور سیرت طیبہؐ کی معلومات کو پرکھیں، ان تمام امور کی درجہ بندی کریں۔ صحیح، ثقہ اور درست معلومات کو ضعیف، موضوع اور زبان زدِ عام عوام معلومات سے الگ کریں یہ ایک انتہائی اہم اور مفید کام ہے۔ جو ایک جانب سیرت طیبہؐ کی ثقہ معلومات مہیا کرے گا، تو دوسری طرف اس کام کی تکمیل سے مستقبل کی سیرت نگاری مستند مواد کی بنیاد پر ہی ممکن ہو گی۔

۴۔ جس طرح مشکل القرآن، مشکل الحدیث، مشکل اسماء الرجال اور مشکل الفقہ کے مضامین پر مصنفین نے قلم اٹھایا اور ان موضوعات پر مثالی کتب مدوّن کی ہیں۔ اسی طرح "مشکل السیرۃ" کے موضوع پر بھی کام کرنا نہ صرف سیرت نگاری کی مشکلات کا حل فراہم کرے گا بلکہ اس طرح سیرت نگاری کے بہت سے عصری تقاضے اور ضرورتیں بھی پوری ہو سکیں گی۔ ہماری دانست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح نگاری میں سب سے مشکل موضوع تواریخ اور ماہ و سال کے تعین کا ہے۔ کہ

سیرت طیبہ کا کونسا واقعہ کس دن، ماہ یا سال میں پذیر ہوا۔ یہ مسئلہ عہد رسالت سے لیکر آج تک حل نہیں ہوا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پہلو مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی ہمیشہ سے شدید ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ بعثت نبویؐ کے وقت عرب معاشرے میں نہ صرف بہت سی تقویم رائج تھیں۔ بلکہ ان کے ہاں "نسیئ" کا رواج بھی عام تھا۔ اس عہد کے عرب معاشرے میں نہ صرف ہر قبیلے کا اپنا اپنا کیلنڈر ہوتا تھا۔ بلکہ مکی اور مدنی کیلنڈر بھی الگ الگ تھے نیز "نسیئ" کے رواج پر عمل کرتے ہوئے عرب سردار اور عرب قبائل مہینوں کے دنوں میں بھی کمی بیشی کرتے رہتے تھے۔ مزید برآں مہینوں میں تقویمِ تاخیر کرتے رہتے تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستند اور ثقہ سوانح عمری ترتیب دینے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے عرب تقویم (arab calendar) کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ کہ مختلف قبائل اور مختلف مقامات کے رواۃ کی بیان کردہ تواریخ سیرت میں موافقت، اور ہم آہنگی قائم کرکے تواریخ سیرت درست کی جاسکیں۔ جو ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔

۵۔ میری رائے میں مستشرقین اور غیر مسلم مصنفین نے اسلام اور مسلمانوں کے تناظر میں سب سے زیادہ اور رکیک اعتراضات سیرت مطہرہ کے متنوع شعبوں پر کیے ہیں، مارگولتھ سے لیکر منٹگمری واٹ اور جان اسپوسیٹو تک سب غیر مسلم مصنفین نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مستودہ صفات کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جس کا جواب دینا مسلمانوں کی دینی اور ملی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں نے یہ ذمہ داری ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن میری دانست میں ان کا اسلوب قائدانہ نہیں بلکہ معذرت خواہانہ رہا ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی سے لیکر پیر کرم شاہ الازہری تک سب نے کسی نہ کسی اسلوب میں سیرت طیبہؐ کے بہت سے پہلوؤں پر معذرت خواہانہ رویہ اپنایا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ سیرت طیبہؐ کے حوالے سے قائدانہ اسلوب (leading role) اپنایا جائے۔ ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیرت نگار سیرت نگاری میں اسلوب روایت، اسلوب درایت، اسلامی منھاجیات، مغربی اسلوب تحقیق اور عصر حاضر کی متداول اور مروجہ زبان میں بخوبی مہارت رکھتا ہو۔ تاکہ وہ عصر حاضر کو سیرت طیبہؐ کا پیغام مؤثر اور مستند طریقہ سے پہنچاسکے۔ اسی کام کی تکمیل سے انسانیت کا بھلا ہوگا۔

۶۔ سیرت طیبہؐ ایک حیاتیاتی موضوع (biological subject) ہے۔ جس طرح انسانی زندگی متنوع بوقلمونیوں سے پُر اور عبارت ہے اور یہ جدید مسائل اور نئے کوائف سے دوچار ہوتی رہتی ہے بعینہ اسی طرح سیرت طیبہؐ میں جدید موضوعات اور مضامین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سیرت مبارکہ کا ہر پہلو سراسر بہار ہے۔ اس لیے یہ عمل آج بھی جاری ہے اور مستقبل کا سیرت نگار بھی اس تبدیلی اور اضافے سے دوچار ہوگا۔ اس لیے مسانید سیرت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس صورت حال پر فوراً بھرپور توجہ دیں۔ نیز ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کی منصوبہ سازی کریں۔ اس مقام پر سیرت طیبہ کے چند جدید موضوعات کی فہرست بطور نمونہ شامل کی جارہی ہے۔ اس فہرست میں مزید موضوعات کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

سیاسیات سیرت، سیرت طیبہؐ اور سفارت کاری، عسکریات سیرت، اجتماعیات سیرت، نفسیات سیرت، وثائق سیرت، سوانح عمری کے جدید آفاق، تقویم سیرت، مشکلات سیرت، اداریات سیرت، سلاطین اور حکمرانوں کو لکھے گئے خطوط، مستقبلیات سیرت، معاشیات سیرت، سیرت طیبہؐ میں سراغ رسانی، ہجرت حبشہ کے اسباب و مضمرات، بین الاقوامی قانون اور سیرت، طب نبویؐ، سیرت کا موضوعاتی پہلو، سیرت کا مناظراتی ادب، کتب سیرت کی درجہ بندی، جغرافیہ سیرت، آثار سیرت، کتب سیرت کی زبانیں، فہارس کتب سیرت، رجال سیرت، اسلامی علوم وفنون اور سیرت، مخطوطات سیرت، خصائص و معجزات سیرت، جزیات سیرت، اسرائیلیات سیرت اور مستقبل سیرت۔

یہ چند موضوعات بطور نمونہ اور مثال تحریر کیے گئے ہیں۔ تاہم ان موضوعات کا احاطہ کرنا انسانی بس سے باہر ہے۔

۷۔ جیسا کہ سابقہ سطور میں واضح ہے کہ سیرت طیبہؐ کوئی جامد موضوع نہیں ہے بلکہ متحرک اور سدا بہار مضمون ہے۔ اس میں نئے موضوعات کا پیدا ہونا اور موضوعات میں جدت کا سامنے آنا نیز ذیلی موضوعات کا وجود میں آنا معمول کی بات ہے۔ اس لیے آج کے انسان اور عصر حاضر کے مسلمان کو جو مسائل اور مشکلات درپیش ہیں، وہ سبھی سیرت طیبہ کا موضوع ہیں، اس لیے مسانید

سیرت کو مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ چنانچہ اگر انسان خلاء (space) میں عمل دخل کرتا یا کسی اور سیارے پر قدم جماتا اور آباد ہوتا ہے، تو انسان اور مسلمان کو وہاں بھی سیرت طیبہؐ کی ہدایت اور رہنمائی مطلوب ہوگی۔ اس لیے سیرت کا مستقبل ایک اہم اور دلچسپ پہلو ہے۔

سیرت طیبہ کے قدیم وجدید موضوعات پر کام کرنے کے لیے محققین کے لیے ضروری ہے، کہ وہ سیرت طیبہؐ کے اصلی مصادر تک رسائی رکھتے ہوں۔ ان بنیادی مصادر سے استفادہ کر کے سیرت طیبہؐ کے موضوعات اور تحلیل کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ انہیں مشرقی زبانوں، غیر ملکی زبانوں اور جدید مناہج تحقیق پر مکمل عبور حاصل ہو۔ وہ انسان اور مسلمانوں کے عصری مسائل سے بخوبی آگاہ ہوں۔ مزید برآں وہ تحقیق کی تربیت اور تحقیقی رجحانات سے بھی آگاہی رکھتے ہوں۔ تاکہ وہ نہ صرف سیرت نگاری کا حق ادا کر سکیں بلکہ وہ وطن عزیز کے استحکام اور ترقی میں خاطر خواہ کردار ادا کر سکیں۔

مسانید سیرت کے پروگرام میں تحقیق کو خصوصی اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ کیونکہ مستقبل میں اعلیٰ تعلیمی ادارے تعلیم و تدریس سے کم اور تحقیق سے زیادہ پہچانے جائیں گے۔ مزید برآں مسلمانوں کو اقوام عالم میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے تحقیق پر زیادہ انحصار کرنا ہوگا۔ جبکہ سیرت طیبہؐ کے موضوعات پر تحقیق کرنا مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس لیے سیرت طیبہؐ کے اداروں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ تحقیقی منصوبوں کو پہلی ترجیح کے طور پر اپنائیں اور عصری تقاضوں کے مطابق انفرادی تحقیق کی جگہ اجتماعی تحقیق (collective research) کو رواج دیں۔ تاکہ اجتہادی ضرورتیں پوری ہوں، اور سیرت طیبہؐ کے مضوعات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو نیز سیرت مبارکہ کے جدید اور مشکل موضوعات کی کم وقت اور بہتر انداز میں تکمیل ہو۔

PRESIDENT MAMNOON HUSSAIN GIVING AWAY PRIZES TO THE AWARD WINNING AUTHORS & POETS OF SEERAT AND NAAT DURING THE INTERNATIONAL SEERAT-UN-NABI (PBUH) CONFERENCE IN ISLAMABAD ON DECEMBER 2, 2017

عدت کی مدت

جدید طبّی تحقیقات کی روشنی میں
شرعی نقطۂ نگاہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

ڈاکٹر انعام اللہ

چیف ریسرچ آفیسر/ڈی جی (ریسرچ)

پس منظر:

جناب مبشر میرؔ، جائنٹ ایڈیٹر، ڈیلی پاکستان کراچی نے مراسلہ مؤرخہ ۷ دسمبر ۲۰۰۶ء بنام چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ عدت کی مدت ۹۰ دن کے لگ بھگ ہوتی ہے، جو طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں بیوی کو گزارنی پڑتی ہے۔ جدید طبّی تحقیقات کی روشنی میں عدت کے قانون (مدت) کو از سرِ نو تشکیل دینا چاہیئے، اس لیے کہ آج کل بڑی آسانی سے عورت کے حاملہ ہونے کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، یورین ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے سے بھی اس کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس موضوع پر ایک تحقیقی مطالعہ اور مباحثہ کے لیے ایک ورکشاپ کا انعقاد کرے۔ اس لیے کہ یہ وقت ہے کہ ملک اور اُمّت کی بہتری کے لیے کام کیا جائے۔ ابھی وقت ہے کہ معاشرے میں خواتین کو سماجی طور پر ترقی دی جائے اور خواتین کو اختیارات سونپے جائیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک متحرک اور مذہبی جذبے کے ساتھ اس صدی کے اندر اس سائنسی طریقے کو اختیار کیا جائے۔ میڈیکل ٹیسٹ رپورٹ کے ذریعے سے ہم عدت کے مسئلے کو ختم کرسکتے ہیں اور یوں خواتین معاشرے کے اندر بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کردار ادا کر سکیں گی۔ کونسل کے محترم اراکین میری اس تجویز کو درخورِ اعتناء سمجھیں گے، اور اس حوالے سے ضروری اقدامات کریں گے۔

راقم الحروف نے کونسل کے شعبہ ریسرچ میں رائج طریقہ کار کے مطابق مراسلہ نگار کے آراء اور تجاویز کے تناظر میں شرعی حوالے سے عدت کے مسئلے پر ایک مضمون تیار کیا، جو زیرِ بحث مسئلے کے ساتھ کونسل کے ایجنڈا پر اجلاس نمبر ۱۶۴ میں پیش کیا گیا، مضمون میں مراسلہ نگار کی آراء اور مؤقف کا تجزیہ کیا۔ اور عدت کے متعلق امت کا اجماعی مؤقف بیان کرتے ہوئے ثابت کیا کہ عدت کی شرعی مدت میں خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اس حکم کو نظر انداز کرنے کی صورت میں خواتین کئی ایک حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔

یہ مسئلہ کونسل کی لیگل کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد دو آراء سامنے آئیں: کمیٹی کے دو ارکان جناب جاوید غامدی اور ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے رائے دی کہ ”طبی تحقیقات کی بنیاد پر عدت کی مدت مقرر کی جاسکتی ہے“۔ جبکہ جناب جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل کی رائے یہ تھی، کہ ”طبی تحقیقات کی بنیاد پر عدت کی مدت مقرر نہیں کی جاسکتی“۔ لیگل کمیٹی کی متذکرہ بالا رائے کے ساتھ راقم کا حسب ذیل مضمون کونسل کے غور و خوض کے لیے پیش کیا گیا۔

جاوید احمد غامدی

جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل

شرعی نقطۂ نگاہ اور مراسلہ نگار کی آراء کا جائزہ

عدت کا مفہوم:

جب میاں بیوی کے درمیان نکاح کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے طلاق، خلع یا لعان کی وجہ سے، فسخ یا تفریق کی بنیاد پر یا پھر شوہر کی موت کی وجہ سے، تو خاتون پر لازم ہوتا ہے کہ وہ عدت گزارے، جس کی مدت تین مہینے، تین ماہواری یا چار (قمری) مہینے دس دن ہوتی ہے۔ عدت کی ان تین مدتوں میں دو مدت تو متعین ہیں یعنی تین مہینے اور چار مہینے دس دن۔ اور ایک مدت یعنی تین ماہواری میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق تین ماہواری کی مدت کم سے کم ۶۰ دن میں پوری ہو سکتی ہے جب کہ صاحبین کی تحقیق کے مطابق یہ مدت کم سے کم ۳۹ دن میں بھی پوری ہو سکتی ہے (1)۔ اس لحاظ سے مطلقہ حائضہ کی عدت تین مہینے سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔

عدت کے دوران معتدہ (عدت گزارنے والی خاتون) دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے نہ اس کو صراحۃً نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس عرصے میں معتدہ اس مکان میں رہے گی جس میں جدائی کے وقت میاں کے ساتھ وہ رہائش پذیر تھی، الّا یہ کہ کوئی عذر ہو تو وہ مکان تبدیل بھی کر سکتی ہے اور عارضی طور پر اس مکان سے باہر بھی جا سکتی ہے (2)۔

عدت کی مدت اور دیگر احکام کی شرعی حیثیت اور ثبوت :

مندرجہ ذیل قرآنی آیات عدت کے شرعی تصور کے دلائل اور بنیاد ہیں۔

مطلقہ کی عدت:

۱- وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ: ۲۲۸)

(اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔ اور اگر وہ خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کو جائز نہیں کہ خدا نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں اور ان کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس مدت میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسا دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ اور خدا غالب اور صاحب حکمت ہے۔)

متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت:

۲- وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ۔

(البقرہ: ۲۳۵-۲۳۴)

(اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں تو عورتیں چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں اور جب یہ عدت پوری کر چکیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ اگر تم کنائے کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے

دلوں میں مخفی رکھو، تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ خدا کو معلوم ہے کہ تم ان سے (نکاح کا) ذکر کروگے مگر (ایامِ عدت میں) اس کے سوا کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو، پوشیدہ طور پر اس سے قول و قرار نہ کرنا۔ اور جب تک عدت پوری نہ ہو نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔ اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، خدا کو سب معلوم ہے۔ تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ خدا بخشنے والا اور علم والا ہے۔)

آئسہ کی عدت:

۳- وَالّٰٓئِيۡ يَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِيۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ وَّالّٰٓئِيۡ لَمۡ يَحِضۡنَ۔ (الطلاق:۴)

(اور تمہاری مطلقہ عورتیں، جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (انکی عدت کے بارے میں) شبہ ہو، تو ان کی عدت تین مہینے ہیں، اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا (ان کی عدت بھی یہی ہے)

حاملہ کی عدت:

وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ يَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ۔ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا (الطلاق: ۴)

(حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے، اور جو خدا سے ڈرے گا، خدا اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا۔)

غیر مدخول بہا مطلقہ کی عدت:

۴- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا۔ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا (الاحزاب:۴۹)

(مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے ان کو ہاتھ لگانے (یعنی ان کے پاس جانے) سے پہلے طلاق دے دو تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کراؤ ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کرو)

احادیث نبویہ میں بھی وضاحت کے ساتھ عدت کی مدت متعین کی گئی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

لا يحل لامرأة تو من بالله و اليوم الآخر تحد على ميت فوق ثلاث الا على زوج اربعة اشهر وعشراً (3)

(اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والی خاتون کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دنوں زیادہ سوگ منائے ماسوائے شوہر کے کہ اس پر چار مہینے دس دن سوگ منائے گی۔)

عدت کے بارے میں ان شرعی نصوص کی عبارت النص سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱- غیر حاملہ مطلقہ حائضہ عورتوں کی عدت (یعنی عدت طلاق) تین ماہواری ہے۔

۲- غیر حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت (عدتِ وفات) چار مہینے دس دن ہے۔

۳- آئسہ (جن کو صغر سنی یا کبر سنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو) کی عدت طلاق تین مہینے ہیں۔

۴- حاملہ (مطلقہ یا متوفی عنہا زوجہا) کی عدت وضعِ حمل ہے۔

۵- مطلقہ غیر مدخول بہا پر عدت لازم نہیں۔ (4)

مراسلہ نگار نے اپنا مؤقف ثابت کرنے کے لیے جن امور کا سہارا لیا ہے، ان میں سے اکثر باتیں نہایت سرسری ہیں۔ ان سے مراسلہ نگار کا مؤقف ثابت نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کے دعویٰ اور پیش کردہ دلائل میں کوئی مناسبت نہیں۔ تاہم اس مراسلے کی روشنی میں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا جدید طبی تحقیقات کی بنیاد پر "عدت کی مدت" از سر نو مقرر کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کی بنیادی منشأ یہ ہے کہ چونکہ عدت کی مدت کی تعیین کا دارومدار محض استبراء رحم پر ہے اور جب کسی بھی طریقے سے استبراء رحم کا یقین ہو جائے تو پھر "عدت" کی مزید ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس دلیل کی صحت کو فرض کیا جائے، تو ایک اور اہم بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ کیا قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلائل کے ساتھ ثابت شدہ منصوص علیہ امور (مثلاً عدت کی مدت) میں شارع کے بغیر از خود تبدیلی جائز ہے؟ یہ سوال اس لیے سامنے آتا ہے کہ متذکرہ بالا دلیل کی صحت اس بات کو مستلزم ہے۔

اس دوسرے سوال کا جواب، جیسا کہ واضح ہے، نفی میں ہے۔ قران و سنت کی واضح نصوص یہی بات بتلاتی ہیں۔ اس کے خلاف صرف یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی ایک یا معدودے چند افراد کا فہم نصوص یا تعبیر و تشریح اس کے خلاف ہے۔ اس دلیل کا جواب نہایت سادہ سا ہے۔ اگر محض کسی کا فہم یا تعبیر ہی شرعی مسائل کی بنیاد ہو تو واضح رہے کہ اس کے مقابلے میں عدت سے متعلق تمام نصوصِ شرعیہ کے بارے میں متقدمین و متاخرین جمہورِ امت کا فہم یا تعبیر و تشریح بھی بنیاد بن سکتا ہے بلکہ اجماعی فہم ہونے کی وجہ سے اسی کو ہی ترجیح حاصل ہے۔

اب ہم متذکرہ بالا دلیل کی طرف آتے ہیں۔

یہ دلیل کسی حد تک صحیح ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دلیل کی صغری سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ بلا شک و شبہ عدت کی مدت کے تعیین میں استبراء رحم مد نظر رکھا گیا ہے اور استبراء رحم فی نفسہ مقصود بھی ہے۔ تحفظِ نسل شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ تفریقِ زوجین کی صورت میں استبراء رحم کا اہتمام نہ کیا جائے، تو نسل مشتبہ ہوسکتی ہے اور شریعتِ اسلامیہ کی رو سے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔ استبراء رحم کا اہتمام نہ کرنا جاہلی رسوم اور طور طریقوں میں سے ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں زمانہ جاہلیت میں رائج نکاح کے طریقوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔(5) لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عدت کی مدت کا دارومدار محض استبراء رحم پر نہیں۔ عدت کی مدت اور استبراء رحم کا آپس میں تعلق یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ عدت کے اختتام کے لیے استبراء رحم کا ہونا ضروری ہے تاہم استبراء رحم کا یقین حاصل ہونا عدت کے اختتام کو مستلزم نہیں۔ حسب ذیل وجوہات اس دعوے کے اثبات کے لئے کافی ہیں:

۱- استبراء رحم عدت کی مدت کے تعین میں علت مؤثرہ نہیں بلکہ عدت کے مصالح اور حکمتوں میں سے ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ مصلحت و حکمت پر وجوداً اور نفیاً حکم دائر نہیں ہوتا، جیسا قرآن مجید کی رو سے شراب کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ شراب پینے کی صورت میں شیطان کو "عداوۃ" پیدا کرنے اور نماز میں رکاوٹ ڈالنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ اب کوئی کہہ دے کہ: شراب پینے کے باوجود میں یہ مواقع فراہم نہیں ہونے دوں گا، اس لیے میرے لیے شراب نوشی جائز ہے۔ تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔(6)

۲- عدت کے مصالح اور حکمتیں استبراء رحم میں منحصر نہیں بلکہ اس کے علاوہ تعبد، شوہر کی جدائی پر اظہارِ حسرت اور طلاق کی صورت میں شوہر کو سوچ وبچار کرنے کا موقع فراہم کرنا بھی ہیں۔ (7)

۳- عدت کا حکم امر تعبدی ہے اور امورِ تعبدی (منصوص احکامِ شرعیہ) کے اندر علل (منصوص و غیر منصوص) کی تعیین صرف اس مقصد کے تحت کی جاتی ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر غیر منصوص احکام کو ان پر قیاس کیا جائے، اس لئے نہیں کہ منصوص حکم کا وجوداً و عدماً مدار اس علت پر ہو۔(8)

۴- اگر عدت کی مدت کا دارومدار محض استبراء رحم پر ہوتا تو لونڈی اور آزاد خاتون کی عدت میں فرق ملحوظ نہ رکھا جاتا، جب کہ دونوں کی عدت میں بالاتفاق فرق ہے۔ اس فرق کی بنیاد یہ حدیث نبوی ہے: **طلاق الامۃ تطلیقتان وعدتھا حیضتان**(9) (لونڈی کی طلاق دو طلاق ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) فقہاء کا اس حدیث سے

استدلال کرنا اور تلقی بالقبول کرنا اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔(10)

۵- استبراءِ رحم محض ایک حیض سے بھی یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ غیر نکاح (لونڈی خریدنے کی صورت میں) جہاں استبراء مقصود ہوتا ہے وہاں ایک ہی مہینہ یا ایک ہی حیض پر اکتفا کیا جاتا ہے۔(11) اگر اتنی سی بات کافی ہوتی تو عدت کے اندر قرآن مجید تین قروء (حیض / طہر) کو لازم نہ قرار دیتا۔

۶- اگر متوفیٰ عنہا زوجہا غیر حاملہ چار مہینے دس دن سے کم عرصے میں تین قروء (حیض / طہر) کے مرحلے سے گزر جائے تو بھی قرآن کی صریح نص کی رو سے اس کی عدت چار مہینے دس دن ہو گی۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ عدت کا دارومدار محض استبراءِ رحم پر نہیں بلکہ نصوص پر ہے۔

۷- طبی اصولوں کے مطابق نابالغ بچی اور عمر رسیدہ خاتون (شرعی اصطلاح میں آئسہ) کو استقرارِ حمل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود بنصِ قرآنی ان کی عدت تین مہینے ہیں۔ اگر استبراء رحم ہی پر عدت کا دارومدار ہوتا تو ان دونوں قسم کی خواتین کی عدت ہی نہ ہوتی۔

۸- جب زوجین کے درمیان خلوتِ صحیحہ ہو جائے لیکن بالفعل ہمبستری نہ ہو اور دونوں کو یقین ہو کہ حمل کا شبہ تک نہیں تو بھی جدائی کی صورت میں عدت لازم ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محض استبراءِ رحم پر عدت کا دارومدار نہیں۔

درج بالا تمام وجوہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عدت کی مدت کی تعیین کا دارومدار محض استبراءِ رحم پر نہیں بلکہ یہ امر تعبدی ہے۔ تاہم عدت کے اختتام کے لیے استبراءِ رحم کا ہونا ضروری ہے۔

اب چند دیگر امور ذکر کیے جاتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شریعت کے متذکرہ بالا منصوص حکم میں تبدیلی کی صورت میں کئی ایک شرعی احکام متاثر ہوں گے۔ چنانچہ ذیل کی سطور میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس منصوص شرعی حکم میں تبدیلی کی وجہ سے ان احکام پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے۔

☆ از روئے حدیث طلاق کا سنت طریقہ یہ ہے کہ شوہر طہر کے اندر، جس میں ابھی ہمبستری نہ ہوئی ہو، ایک طلاق دے دے۔ پھر سوچ وبچار کے بعد یا تو عدت کے اندر رجوع کرے، یا عدت کے اختتام پر نکاح ختم ہو جائے گا۔ اور اگر تین طلاقیں دینا چاہے، تو ہر طہر میں ایک ایک طلاق دے۔(12) سوال یہ ہے کہ قبل از وقت عدت ختم ہونے کا فیصلہ کیا جائے تو اس صورت میں طلاق کا سنت طریقہ کیا ہو گا؟

☆ شریعت نے میاں بیوی کو سوچ وبچار کرنے کے لیے جو مہلت دی ہے۔ اس طرح وہ دونوں اس رعایت سے محروم ہو جائیں گے۔

☆ طبی تحقیق کی بنیاد پر عدت ختم ہونے کا اعلان کر دیا جائے تو شوہر قبل از وقت رجوع کے حقِ شرعی سے محروم ہو جائے گا۔

☆ اگر عورت بھی سابقہ نکاح کو برقرار رکھنے کی خواہشمند ہو، تو اس کے لیے یہ امکانی راستہ قبل از وقت بند ہو جائے گا۔

☆ والدین کے درمیان تفریق کے بُرے اثرات سے بچوں کو محفوظ رکھنے کے امکانی راستہ کو قبل از وقت مسدود کرنا بچوں کی حق تلفی ہو گی۔

☆ پہلے شوہر کا شرعی حق ہے کہ عدت کے اندر خاتون کو نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے نہ اس سے نکاح ہو سکتا ہے۔ قبل از وقت عدت ختم کر کے شوہر کی حق تلفی ہو گی۔

☆ طلاقِ رجعی اور طلاقِ بائن دونوں صورتوں میں عدت والی خاتون کا نان نفقہ، لباس اور رہائش شوہر کے ذمے ہے، اگرچہ بعض صورتوں میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ قبل از وقت عدت ختم کر کے عورت کی حق تلفی ہو گی۔

☆ طلاقِ رجعی کی عدت میں میاں بیوی میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا وارث کا حقدار ہوتا ہے۔ طلاقِ بائن اور طلاقِ مغلظہ کی عدت میں بھی عورت شوہر کی وارث بنتی ہے اگر شوہر نے حالتِ مرض میں بیوی کی رضامندی کے بغیر طلاق دی ہو۔(13) شرعی عدت کے اختتام سے قبل محض طبی تحقیق کی بنیاد پر عدت ختم کر کے میاں بیوی ایک دوسرے کی وراثت سے محروم ہو جائیں گے۔

☆ ایک یا دو طلاقوں کی صورت میں عدت کے اندر شوہر کو مزید ایک یا دو طلاق دینے کا حق ہوتا ہے۔ عدت جلدی ختم کر کے قبل از وقت شوہر کے اس حق پر پابندی لگ جائے گی۔

☆ حضانت (بچوں کی پرورش) واجب ہے طلاق یا وفات کی وجہ سے تفریق واقع ہو جائے تو از روئے حدیث حضانت کی پہلی حقدار ماں ہے۔ حقِ حضانت اختیاری ہے لیکن دوسرا حاضن نہ ہو تو بچے کو ہلاکت سے بچانے اور اس کے حق کی رعایت کرنے کی وجہ سے یہ حق اجباری بن جاتا ہے۔ دوسری طرف حاضنہ اگر بچے کے غیر محرم سے شادی کرتی ہے تو حقِ حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔(14) عدت برقرار رہنے تک حقِ حضانت کے اسقاط کا احتمال ہی نہیں ہوتا۔ اگر عدت کو قبل از وقت ختم کر دیا جائے اور ممکن ہے کہ وہ خاتون فوراً دوسرا نکاح کرے تو صرف بچے کی حق تلفی نہیں بلکہ اس کی ہلاکت اور ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ عورت کے مزعومہ حق کے تحفظ کے لئے معصوم بچوں کے حقوق پامال کرنا قرین قیاس نہیں۔

☆ شریعت نے استبراء رحم جاننے کا جو طریقہ (عدتِ شرعی) مقرر کیا ہے وہ یقینی ہے، اور ہر عام و خاص کو میسر ہے، جب کہ طبّی تحقیقات پر مبنی طریقہ ظنی ہے۔ اس میں جھوٹی اور خلافِ حقیقت رپورٹ تیار کرنے کا احتمال ہے۔ اور ہر عام و خاص کو میسر نہیں۔ چنانچہ جو لوگ دور دراز پہاڑوں اور صحراؤں میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے مہلک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں بھی میڈیکل ٹیسٹ نہیں کرا سکتے یا نہیں کراتے وہ عدت کو قبل از وقت ختم کرانے کے لیے کیونکر یہ مہنگا طریقہ اپنائیں گے؟ تو کیا ان کے لیے عدت کی مدت کا الگ معیار ہو گا؟ اور شہری لوگوں کے لیے الگ؟

☆ اگر عدت طلاق یا وفات والی عورت اقرار / اعتراف کرے، کہ میری عدت ختم ہو گئی۔ ابھی اس نے دوسرا نکاح نہیں کیا کہ وہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ اگر اختتام عدت کے اقرار کے چھ مہینے (اقل مدت حمل) کے بعد بچے کی ولادت ہوئی ہے، تو یہ بچہ ثابت النسب نہیں ہو گا۔ لیکن اگر چھ مہینے (اقل مدت حمل) کے اندر بچے کی ولادت ہوتی ہے تو یہ بچہ ثابت النسب ہو گا۔ اور وہ خاتون اپنے اقرار اور اعتراف میں جھوٹی سمجھی جائے گی (15) گویا امکانی طور پر یہ عرصہ کم از کم آٹھ یا سات مہینے دس دن تک ہو سکتا ہے۔ اگر قبل از وقت عدت کے اختتام کا فیصلہ کیا جائے، تو بچے کے ثابت النسب ہونے کے اِحتمال کا عرصہ متذکرہ بالا امکانی عرصے سے بھی کم ہو جائے گا۔ مسلمان معاشرے میں بچے کو ثابت النسب قرار دینے کے لیے شرعی وجہ تلاش کرنا ہی روح شریعت ہے۔ ثبوتِ نسب کے احتمال کو کم کرنا نہیں۔

ان چند گزارشات کی روشنی میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ عدت کی مدت متعین کرنے میں طبّی تحقیقات کو معیار مقرر کرنا نہ صرف یہ کہ ایک منصوص اور قطعی شرعی حکم کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے، بلکہ مرد و زن دونوں کو کئی ایک حقوق سے محروم کرنے کے بھی مترادف ہے۔ مزید برآں کئی دیگر احکام کو بھی تبدیل کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اس سے احتراز ہی ضروری ہے۔

بعد ازاں کونسل نے کمیٹی کی رائے اور مضمون ملاحظہ کیے، اور بحث و تمحیص کے بعد پانچ ارکان نے پہلی رائے سے اتفاق کیا جبکہ دو اراکین جناب مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی اور جناب مولانا عبداللہ خلجی نے دوسری رائے کی تائید کی نتیجتاً تین اراکین کے اختلاف کے ساتھ کثرت رائے کی بنیاد پر پہلی رائے کی منظوری دی گئی۔ اور حسب ذیل سفارش مرتب کی گئی:-

فیصلہ: طبی تحقیقات کی بنیاد پر عدت کی مدت مقرر کی جاسکتی ہے۔

جناب جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل، جناب مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، جناب مولانا عبد اللہ خلجی کی اختلافی رائے:

طبی تحقیقات کی بنیاد پر عدت کی مدت مقرر نہیں کی جاسکتی، عدت کی تمام اقسام کی مدت قرآنی نصوص کے اندر صراحت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے لہذا ہمیں اللہ اور رسول ﷺ کی کہی بات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے اور انہی کے فرامین کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ (سالانہ رپورٹ ۰۷- ۲۰۰۶ء، ص:۲۶۰)

بعد ازاں! جب مولانا محمد خان شیرانی رکن کونسل مقرر کئے گئے تو انہوں نے مراسلہ مؤرخہ ۲/ستمبر ۲۰۰۹ء بنام چیئرمین کونسل میں منجملہ دیگر سفارشات کے زیر بحث سفارش کو اس بنیاد پر دوبارہ زیر بحث لانے کی تجویز پیش کی کہ یہ سفارش قرآن و سنت کی نصوص سے متصادم ہے۔ معززرکن کونسل کا یہ مراسلہ متعدد اجلاسوں میں ایجنڈا پر رکھا گیا، تاہم موضوع پر بحث کی نوبت نہیں آئی۔ تا آنکہ جناب شیرانی صاحب چیئرمین کونسل متعین ہوئے، ان کی چیئرمین شپ میں متعدد دیگر سابقہ سفارشات کے ساتھ عدت سے متعلق سابقہ سفارش راقم الحروف کے تحریر کردہ مضمون کے ساتھ کونسل کے ایجنڈا پر رکھا گیا۔ کونسل نے پہلی سفارش کے برعکس مضمون میں اختیار کردہ مؤقف کے مطابق دوسری سفارش مرتب کی۔ جو حسب ذیل ہے:

عدت کی مدتیں قرآن مجید کی آیات میں صراحۃ متعین ہیں۔ لہذا طبی تحقیقات کی بنیاد پر عدت کی مدت مقرر نہیں کی جاسکتی۔ (سالانہ رپورٹ ۱۱-۲۰۱۰ء، ص:۵۱)

حوالہ جات

(1) الکاسانی، علاء الدین، أبو بکر بن مسعود بن أحمد الحنفی (المتوفی: ۵۸۷ھ) البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۳/ ۱۹۸

(2) المرغینانی، برھان الدین علی بن أبی بکر، المتوفی: ۵۹۳ھ، الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی الھدایۃ، کتاب العدۃ، ۱/ ۴۰۷

(3) البخاری، محمد بن إسماعیل أبو عبداللہ، الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ، صحیح

(4) البخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر: ۵۳۴۵

(5) المرغینانی، برھان الدین علی بن أبی بکر، المتوفی: ۵۹۳ھ، الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدي الھدایۃ، کتاب العدۃ: ۱/ ۴۰۶

(5) البخاری، محمد بن إسماعیل أبو عبداللہ، الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر: ۵۱۲۷

(6) صدر الشریعہ، عبید اللہ بن مسعود، سعد الدین مسعود بن عمر، شرح الوقایۃ ۵۳، ۵۲/ ۴

(7) دیکھئے، الزُّحَیْلِيّ، أ. د. وَھْبَۃ بن مصطفی، الفقہ الاسلامی وأدلّتہُ ۷/ ۶۲۷

(8) شرح التلویح مع التوضیح، ص: ۵۵۵

(9) السِّجِسْتانی: (ابو داؤد سلیمان بن الأشعث، المتوفی: ۲۷۵ھ) سنن أبی داوٗد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر ۲۱۸۹

(10) بذل المجھود شرح سنن ابی داؤد، ۱۰/ ۲۷۰، نیز دیکھئے اعلاء السنن، ۱۱/ ۱۸۷، ۱۸۸

(11) صدر الشریعۃ، عبید اللہ بن مسعود، شرح الوقایۃ: ۴/ ۵۲

(12) بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر: ۵۲۵۱

(13) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۶۶۴

(14) حوالہ مذکور: ۷/ ۱۹۷اور ۴۲۸

(15) الفقہ الاسلامی: ۷/ ۶۸۵

دستاویزات اور خصوصی رپورٹ

(علامہ محمد اسد)

ڈائریکٹر، اسلامک ری کنسٹرکشن
حکومت مغربی پنجاب
لاہور، ۱۸اگست، ۱۹۴۸ء

یادداشت بخدمت مرکزی حکومت

پاکستان میں نفاذ شریعت، اگست ۱۹۴۸ء

(پاکستان میں اسلامی تشکیل کے حوالے سے اہم دستاویزات)

یہ یادداشت علامہ محمد اسد نے محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۸/ اگست ۱۹۴۸ء کو انگریزی زبان میں
(MEMORANDUM: ENFORCEMENT OF SHARIAH IN PAKISTAN, 18th August, 1948)
کے عنوان سے مرکزی حکومت کو بھیجی[1]۔ یادداشت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(یادداشت: پاکستان میں نفاذِ شریعت)[2]

یادداشت کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ، مغربی پنجاب کی سرگرمیوں سے مرکزی حکومت کو کچھ تشویش لاحق ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے ان تحفظات کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اس وقت بعض حلقوں میں پاکستان میں نظام شریعت کے قیام کا دعوی کر کے ملک کو ایک رجعت پسندانہ رُخ دینے اور ملکی حکمت عملی کو تنگ اور جامد ذہنیت کے ساتھ اسلام کی عکاسی کرنے کی طرف موڑنے کا رجحان پایا جاتا ہے، جو کہ ان صدیوں کا ایک کردار ہے جن میں ہم زوال کا شکار تھے - بلکہ در حقیقت، وہی ہمارے تنزل کا سبب تھا؛ اور چوں کہ محکمہ اِحیائے ملت اسلامیہ کا قیام نظریۂ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے مقصد سے عمل میں آیا ہے، تو خدشہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ان رجعت پسندانہ رجحانات کو تقویت پہنچائیں گی اور اس طرح حکومت کے ان اقدامات کو نقصان پہنچائیں گی جن کے ذریعے حکومت، پاکستان کو ایک روشن خیال اور ترقی پسند ریاست بنانا چاہتی ہے۔

علامہ محمد اسدؒ ادارہ برائے اسلامی تعمیرِ نو (مغربی پنجاب) پاکستان کے سٹاف کے ساتھ

میں شروع ہی سے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ، جو حکومت مغربی پنجاب کی طرف سے میری ذمہ داری میں دیا گیا ہے، اس کا قیام ہمارے اس ملک میں زندگی کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے اور قرآنِ مجید کے پیغام میں مندرج نظریے کا احساس بیدار کرنے میں مدد دینے کے لیے ہی عمل میں لایا گیا ہے۔ مگر، اس کے ساتھ ساتھ، میں زور دے کر اس حقیقت کو بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا تصور، جس کی ہم وکالت کر رہے ہیں، وہ نہیں ہے جو اندھیرے زمانوں سے نسبت رکھنے والے لوگ پیش کرتے ہیں، اور مسلم عوام کے درمیان زیادہ اونچی آواز بھی وہی لوگ لگا رہے ہیں، اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام کے اصل محافظ وہی ہیں۔ حقیقتاً ہمارا ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن / محکمہ احیائے ملت اسلامیہ ہی اسی لیے قائم کیا گیا تھا کہ ایسے ظلماتی تصورات کے

1 یہ یادداشت علامہ محمد اسدؒ نے محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مرکزی حکومت کو بھیجی۔

2 چوہدری مظفر حسین کے پیش لفظ کے ساتھ بزم اقبال کے سہ ماہی مجلہ "اقبال"، جلد ۴۵، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۹۸ء نے صفحات ۱ تا ۲۲ میں دوبارہ شائع کیا۔

مقابلے میں کام کیا جائے اور اسلامی قانون اس طرح پیش کیا جائے کہ ایک روشن خیال ریاست کے سیاق وسباق میں اسے قابل عمل سمجھا جاسکے؛ ہم نے جس قدر تحریریں شائع کی ہیں ان کے ایک محتاط جائزے سے ان کاوشوں کا ثبوت خود بخود مل جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے سیاست دان اور سیاست دانی کے دعوے دار جو اب شریعت کے نفاذ کی دہائی دے رہے ہیں، حقیقت میں انہیں اسلام کی سچائی یا مسلم عوام کی فلاح وبہبود سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ وہ اپنے ذاتی مفادات کی ترویج اور مقتدر مناصب کے حصول کے لیے صرف اسلامی نعروں کو استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری جانب اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ ان طریقوں سے حصولِ اقتدار کا خواب بھی پورا نہیں کر سکتے، کیا ہمارے لوگوں کی غالب اکثریت کی یہ دلی خواہش نہیں ہے کہ پاکستان کو ایک سچی اسلامی ریاست کے قالب میں پھلتے پھولتے دیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں ذاتی مفادات رکھنے والی مختلف پارٹیاں صرف اس لیے اسلامی نعرے استعمال کر رہی ہیں کہ ہمارے اکثر اہل وطن حقیقتاً دِل کی گہرائیوں سے اسلامی اصولوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور انہیں قیامِ پاکستان کا جواز صرف اور صرف اسلامی قانون کے نفاذ میں نظر آتا ہے؛ اور ظلماتی سوچ رکھنے والوں نے جو لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں کر رکھا ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ حصولِ آزادی سے پہلے ان سے جو وعدے کیے گئے تھے، حکومت کی طرف سے وہ وعدے پورے نہیں کیے گئے اور یہ لوگ ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ہماری خود مختاری کے پہلے ہی ہفتے یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ لوگوں کی معاشرتی خود اعتمادی کا انحصار تقریباً مکمل طور پر، اس بات پہ ہو گا کہ حکومت انہیں واضح طور پر اسلام کی جہت پر لے کر چلتی ہے یا نہیں چلتی: کیوں کہ یہی ایک امید تھی جو اتنے سالوں پر محیط سیاسی جدوجہد کے دوران ان کے ذہنوں میں تھی۔ اسی مقصد کے لیے محکمۂ احیائے ملتِ اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کا خاکہ ایک طرح کے "نظریاتی منصوبہ سازی مرکز" کے طور پر تیار کیا گیا تھا جو اس اسلامی جوش جذبے کو بھی برقرار رکھے جو پاکستان بننے کا سبب بنا اور ہمارے ہم وطنوں کی جذباتی قوت کی تعمیری مقاصد کی طرف چلنے کی رہنمائی بھی کرے۔ یہ بالکل ظاہر سی بات تھی کہ اس قسم کی رہنمائی کے بغیر ہمارا معاشرتی وجود خطرے میں پڑ سکتا تھا: کیوں کہ یا تو "مولوی" عنصر لوگوں کو پھٹے پرانے، ناقابل عمل، بوسیدہ فقہی تصورات کے ساتھ چمٹے رہنے کی ترغیب دے دے کر اسلامی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کو ناممکن بنا دیتا، دیگر صورت میں ہمارے پاس تین اختیار ہوتے؛ یا تو قدامت پسند اور تدبر نہ کرنے والے عناصر (جو مولوی کی اصطلاح کے تحت آتے ہیں) کو اجازت دے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو اکیلے اسلام کے برحق نمائندے کے طور پر پیش کرتے، اور اس طرح مستقبل میں ایک طویل عرصے کے لیے، ہماری سماجی، معاشی اور فکری ترقی کو روک دیتے؛ یا اپنے ہم وطنوں کے جذباتی قوت کے پورے کے پورے عظیم ذخیرے کو، جس کا مرکزی نقطہ اسلامی نظریہ ہے، گم ہو کر معدوم ہو جانے دیتے؛ یا پھر جذبے کی اس عظیم طاقت کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بنانے کی سعی کریں- جسے ایک روشن خیال، مضبوط اور ترقی پسند سیاسی نظام کہا جاسکتا ہے- اور اس کی بدولت اسے پوری مسلم کی قیادت کے منصب پر فائز کیا جاسکے۔ واضح سی بات ہے، ان تینوں امکانات میں سے آخری ہی اس قابل ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جاسکے۔ یہ بات بالکل درست طور پر خود قائداعظم نے بھی متعدد موقعوں پر واضح فرمائی۔ آپ ہمیشہ پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے "a State of our own concept" (ہمارے اپنے تصور پر مبنی ریاست) قرار دیتے تھے، جو اپنی رہنمائی قرآنِ مجید سے حاصل کرے گی اور اس کا اسلامی شریعت پر مبنی ایک دستور بھی ہو گا۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قائداعظم کبھی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو ان کی مراد نہ ہوتی؛ اور یہی اعتماد تھا جس کی بنیاد پر حکومت مغربی پنجاب نے ایک محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ (Department of Islamic Reconstruction) قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان کی پہلی دستورساز اسمبلی

AIMS AND OBJECTS
OF THE DEPARTMENT OF
ISLAMIC RECONSTRUCTION
By
Muhammad Asad
Director of Islamic Reconstruction
West Punjab Government
Lahore
Printed by the Superintendent, Government Printing
West Punjab 1974

محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ کا کتابچہ

جو شہنائیاں مولوی بجا رہے ہیں ان سے بہت دور، اس محکمے کا مقصد اپنے قیام کے روزِ اول سے اسلامی قانون کے ایسے تصور کا فروغ ہے جو حقیقی طور پر قرآنِ مجید کے پیغام سے مطابقت رکھتا ہو، اور اس وجہ سے مکمل طور پر ترقی پسندی پر مبنی اور قابلِ عمل ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام، اللہ

تعالیٰ کا قانون ہونے کی حیثیت سے، کسی خاص زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کے ساتھ نتھی نہیں ہے، اس لیے وہ ہم سے ہماری تاریخ کے گزرے اوقات میں رائج ہر قانونی رائے کو ہر حال میں تسلیم کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ جب ہم شریعت کی اصل بنیاد وحی الٰہی کو تسلیم کرتے ہیں، تو ہمیں لازماً یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ہر زمانے کے سماجی، معاشی اور فکری تقاضے بھی اس میں پہلے سے سمو دیے گئے ہیں: مطلب یہ ہے کہ شریعت کا تصور ایک جامد طریقے کے طور پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انسانی ترقی کے تمام امکانات کی اس میں گنجائش ہونا، نیز اس کا انسان کی سماجی نشوونما کے تمام مراحل کی ضروریات کے مناسب حال ہونا ضروری ہے۔ اب یہ بات خود بخود واضح ہے کہ اسلام کی وہ تصویر جو ہمارے پیشہ ور علماء کی اکثریت پیش کررہی ہے، وہ آج کے معاشرے کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتی، کیوں کہ وہ مکمل طور پر جامد اور قانون کے ان تصورات کے ساتھ نتھی ہے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے عظیم محققین کے ہاں جاری تھے۔ اس بنا پر، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ، یہ تصویر شارع کے صحیح مقصد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ کیوں کہ ان عظیم محققین کے قانونی استنباطات ان کے اپنے زمانے میں، اور اسی زمانے کے لیے، عمل میں لائے گئے تھے، اور وہ زمانے کے ساتھ مقید تھے، اس معنی میں کہ وہ اس خاص زمانے کے سماجی اور فکری پس منظر کے ساتھ موافق بنائے گئے تھے - اور اس وجہ سے وہ "حتمی" نہیں ہوسکتے تھے، اس معنی میں کہ وہ تمام زمانوں کے لیے حتمی طور پر قابل نفاذ نہیں تھے۔ یہ نقطہ گزشتہ ایک ہزار سال یا اس کے قریب زمانے تک اکثر - اگرچہ یقیناً سب نہیں - علماء کی نظروں سے اوجھل رہا۔ انہوں نے ہر قسم کے خود مختار اجتہاد پر پابندی لگادی، خود غور وفکر کرنا بھی بند کردیا اور محض اپنے زیادہ تخلیق کار اسلاف کے فکری نتائج پر دارومدار رکھنے کی عادت بنالی۔ انہوں نے انسانی زندگی کی تبدیلیوں اور تاریخی تجربے (جس میں میں سائنسی تجربے کو بھی شمار کرتا ہوں) کی بنیاد پر اسلامی فکر کو ترقی دینے کی بجائے، وہ اطمینان اور خوشی سے وہی نظریات اور تصورات دہراتے رہے جن کا رواج بہت پہلے ماضی میں ہوا تھا: جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام آہستہ آہستہ تمام تخلیقی افکار سے خالی ہوتا چلا گیا، اس نے اپنی سابقہ ثقافتی قوت کھودی اور وہ رفتہ رفتہ بدلے اوقات کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی سے دور ہوتا چلا گیا۔

یہ، بالاختصار، اسلام کے ابتدائی زمانے کی شاندار شروعات کے بعد اس کے مرحلہ وار تنزل کی وضاحت ہے؛ اور یہی ہر قسم کے زندہ غور وفکر کی بندش کی کہانی ہے، جس نے شریعت یا اس چیز کے جسے اس زمانے میں بے جا طور پر شریعت کا نام دیا جارہا ہے - جدید معاشرے کے سیاق وسباق میں مکمل طور پر نفاذ کو ناممکن بنادیا ہے۔ المختصر، یہ جو کچھ ناقابل عمل اور وقت کے تقاضوں سے دور ہے، وہ اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام کے بارے میں اور اس کے قانون کے بارے میں قائم کی گئی وہ آراء ہیں جو زمانے سے مقید قدیم فقہی جزئیات سے ماخوذ ہیں۔

اگر یہ نتیجہ تسلیم کرلیا جائے تو، ہمارے زمانے کے مسلم معاشرے کے لیے دو راستے کھلے رہ جاتے ہیں: یا تو وہ اسلام کے اصل پیغام کی طرف لوٹ آئیں اور اسلام کو ایک بار پھر اپنی سماجی اور ثقافتی ترقی کی عملی بنیاد بنانے کے نقطۂ نظر سے نئے سرے سے اس کی تطبیق کے بارے میں غور وفکر شروع کریں - یا اپنی سیاسی زندگی میں اسلام کے عمل دخل پر مکمل پابندی لگادیں، جیسے کے کمال اتاترک نے اپنے ملک میں کیا۔ میری نظر میں پاکستان کے معاملے میں اس دوسرے حل کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کے وجود کا مکمل طور پر انحصار ہی اسی حقیقت پر ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے مذہبی نظریے کی بنیاد پر اپنے لیے الگ قومیت کا دعویٰ کیا تھا - اور اب تک یہی دعویٰ کررہے ہیں۔ کئی سالوں تک ہم دلائل دیتے رہے کہ جب تک برصغیر کے مسلمانوں کے پاس اپنی کوئی ریاست نہیں ہے تو ان کے لیے بطورِ مسلمان اپنی پہچان برقرار رکھنا ناممکن ہوگا۔ اس بات سے انکار کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ ہماری الگ ریاستی ڈھانچے کے حصول کی خواہش کا منشا ہمارے لوگوں کا یہ فطری عزم تھا کہ ان کے پاس زندگی

اسلامی مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں کی ہجرت

گزارنے کی اپنی کوئی جگہ ہو، جہاں اسلام کا جوہر نشو و نما پاتے ہوئے محض ایک دعوت اور پیغام سے بڑھ کر ایک مکمل سیاسی حقیقت بن جائے۔ صرف اسی سے، نہ کہ کسی اور چیز سے، ہمیں ہندوستان سے علیحدگی کی جنگ لڑنے کا حوصلہ ملا؛ اس سے بھی بڑھ کر: علیحدگی کی جنگ کا جواز ہمیں صرف اسی سے ملا۔ تعمیر پاکستان میں اسلام کے حقیقی کردار کا انکار، پاکستان کے وجود کے حق کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

ظاہر سی بات ہے، کسی معاشرے میں اسلام کو اس وقت تک اپنائیت حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے قانون کو اس معاشرے کے قانونی نظام کی بنیاد نہ بنایا جائے: اس بنا پر نفاذِ شریعت کا مقبول عام مطالبہ ہماری قیام پاکستان کے لیے جدوجہد، اور پھر پاکستان کے حصول کا ایک جائز نتیجہ ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، شریعت کا روایتی تصور، جیسے کہ رجعت پسند مولوی صاحبان اس کی وکالت کرتے ہیں-ملت کے بہترین مفادات کے مطابق نہیں ہے: کیوں کہ وہ اصلی اور کامل بالذات شریعت نہیں ہے جیسے اس کا تصور قرآنِ مجید میں اور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں پیش کیا گیا ہے، بلکہ وہ ایک مجموعہ جاتی ڈھانچہ ہے جس میں- مستند شرعی قوانین کو چھوڑ کر- بہت سے یک طرفہ رائے پر مبنی، وقت کے ساتھ مقید استنباطات اور اضافہ جات شامل ہیں: جو ایسے شرعی قوانین، استنباطات اور ان کے اضافہ جات سے ماخوذ ہیں، جو ہزاروں سال پہلے رائج العمل فکری اور سماجی حالات کی روشنی میں مہیا ہوئے تھے۔ اس لیے اگر، اسلام نے ہمارے زمانے میں "عملی منشور" بنانا ہے، اور اس نے عملی منشور کے طور پر کام کرنا ہے، تو ہمیں اپنے آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک نئے اجتہادی عمل میں لگانا ہوگا دوسرے لفظوں میں، ہم موجودہ فقہی ذخیرے میں شامل، وقت سے مقید تمام روایتی فقہی تشکیلات کا جائزہ لے کر قرآن و سنت کے بارے میں ہمارے اپنے فہم کی روشنی میں فقہی تشکیل ترتیب دینے کو ہدف بنا کر کام کرنا شروع کر دیں۔ مجھے یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی چاہیے کہ اس عمل میں سوال "اسلامی قانون" کی "نئے سرے سے تقییم" کا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، وہ تو اپنی کارآمدگی کے لحاظ سے حتمی ہے۔ البتہ وہ امور جن کا تعلق اس قانون (شریعت) کی تعبیرات اور بہت سے ایسے امور سے متعلق ہے جن میں شرعی احکام کو براہِ راست واضح قانونی شکل نہیں دی گئی ہے، لازمی طور پر ہماری ہمارے اس پروگرام کا موضوع ہونے چاہئیں جس میں ہم زندگی کے حقائق کو ترقی پسندانہ طریقے سے اپنے دائرۂ عمل میں لانا چاہتے ہیں، میری اس سے مراد اجتہادی عمل کا تسلسل ہے۔

قائداعظم اور مفتی فلسطین قاہرہ میں ایک عشائیہ میں موجود ہیں (۱۹۴۶ء)

(میں کئی سال سے اس موضوع پر لکھتا چلا آرہا ہوں، اور یہاں اس پر مزید بحث اس یادداشت کی گنجائش سے بہت دور نکل جائے گی۔ بہر حال تیار حوالے کے طور پر، میں نے اس مسئلے کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان "اسلامی قانون کے اصولوں کے بارے میں [On the Principles of Islamic Law]" ہے)۔

مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس ملک میں پورا قانونِ شریعت یکدم نافذ کرنا نہ قابلِ عمل ہوگا اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی ابھی قانونی تدوین نہیں ہو سکی: اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ روایتی فقہی تصورات کے عملی قانون سازی میں استعمال سے قبل ان کی ایک بار جامع نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے نفاذِ شریعت کی کارروائی ایک طویل عمل ہونا چاہیے، جو کئی سالوں پر محیط ہو۔

فطری سی بات ہے کہ اس سمت پہلا قدم شریعت کی قانونی تدوین ہوگا (اس لفظ کے درست اور اصل مفہوم کے مطابق)۔ اس مقصد کے لیے، میں
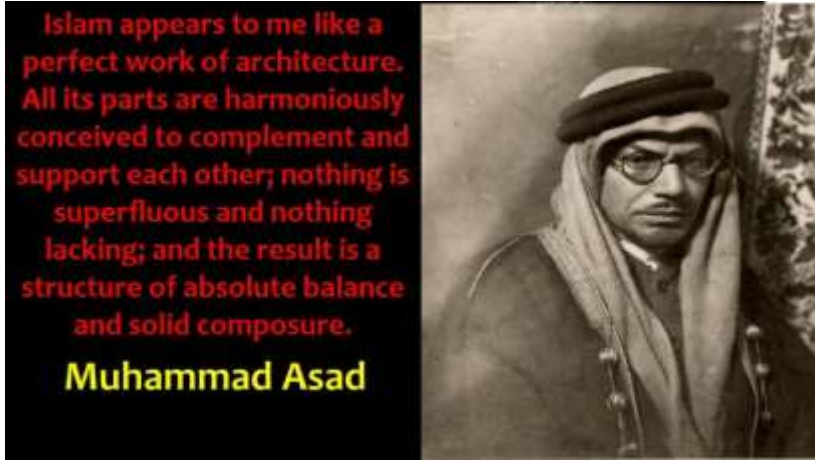
نے کچھ عرصہ قبل درجِ ذیل تجاویز مرتب کی تھیں، جنھیں یہاں لفظ بلفظ دوبارہ تحریر کر رہا ہوں (یہ تجاویز "عرفات"، مارچ ۱۹۴۸ء کے صفحہ ۱۱-۱۲ پر شائع کی گئی تھیں)[3]:

"ایک بہت بڑی مشکل جو اب تک اسلامی تعمیرِ نو کے لیے کوئی واضح لائحۂ عمل تیار کرنے میں رکاوٹ ہے، وہ معاشرتی معاملات سے متعلق شرعی قوانین کی یکساں ضابطہ بندی کی عدم دستیابی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت ملت کے درمیان جو سب سے بڑا پریشان کن تذبذب پایا جاتا ہے وہ اس بات میں ہے کہ کیا "اسلامی" ہے اور کیا "غیر اسلامی"، اور بے یقینی کی یہ کیفیت تمام سماجی و معاشی منصوبوں اور تجاویز میں ہے جن پر آج کل ہر طرف خوب بحث چل رہی ہے۔ اس معاملے میں جو اختلافات مختلف مکتب ہائے فکر کے درمیان - جدید اور قدیم دونوں میں - پیدا کیے جا رہے ہیں، جو زیادہ تر، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے طریقوں اور اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی پیداوار ہیں۔ جب تک ان اختلافات کو ہم آہنگی میں نہیں بدلا جاتا - کم از کم ایسے امور میں جن کا تعلق مشترکہ عملی مسائل سے ہے - اسلامی اقدامی عمل (Islamic action) کا کوئی ایسا لائحۂ عمل ترتیب دینا ناممکن ہے جو اپنے آپ کو تمام موجود مکاتب فکر یا کم از کم اکثر مکاتب فکر سے اپنا آپ منوا سکے۔ پیچیدگی اور اختلاف کی جس حد تک مسلم فقہ گزشتہ صدیوں میں پہنچ چکی ہے، اس کے پیش نظر، فی الحال ایسی کوئی بھی کوشش فضول ہوگی جس کا مقصد موجودہ فقہی اختلافات کو ختم کرنا اور تعبیر واجتہادی استنباطات کے مختلف طریقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہو، جو دراصل اس پیچیدگی کا سبب ہیں۔ لہٰذا اگر، اسلامی اقدام کے لیے کوئی عملی اور قابلِ عمل تجویز پیش کرنی ہے تو، فی الحال ہمیں ان تمام امور سے قطع نظر کرنا ہوگا، جن میں تعبیر اور استنباط کی ضرورت ہے، اور ہمیں صرف ان شرعی قوانین پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی جو بذاتِ خود واضح ہوں اور اسی وضاحت کے ساتھ قرآن و سنت کے ظاہری الفاظ پر مشتمل ہوں، اور ان کے بارے میں مختلف اسلامی مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ اگر ایسے قوانین کی تدوین ہو جائے، تو ان سے اسلامی معاشرتی تعمیرِ نو کا مقصد حاصل کرنے کے لیے کم از کم متفقہ بنیاد میسر آجائے گی"۔

لہٰذا، اس محکمے کی تجویز ہے کہ، تمام مکاتبِ فکر کے معتبر علماء سے درخواست کی جائے، اور وہ اپنے قابل ترین نمائندے، مستقبل میں زیر تشکیل ایک شریعت کمیٹی کے رکن بننے کے لیے نامزد کریں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ قرآن و سنت کے ان معاشی اور اجتماعی احکام کی تدوین اور ضابطہ بندی کرے جنھیں نصوص کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے - یعنی جو مکمل طور پر واضح ہوں - اور ان کے الفاظ کے واضح ہونے کی وجہ سے ان کی کسی اختلافی تعبیر و تشریح کی گنجائش ہی نہ رہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس عمل سے نئے شرعی قوانین "وضع کرنے" یا پہلے سے موجود شرعی قوانین کو ہی "نئے سرے سے وضع کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حوالے کی جو شرائط کمیٹی کو جاری کی جائیں گی، ان کے مطابق کمیٹی صرف قرآن مجید اور معتبر روایات، جو

3 عرفات اردو، جلد ۱، عدد ۱، مارچ ۱۹۴۸ء، جمادی الاول ۱۳۶۷ھ، ص ۱۷- ۲۴؛ عرفات انگریزی: مارچ ۱۹۴۸ء، عدد ۱، ص ۱۱- ۱۲۔ اس سے قبل علامہ اسد نے پورا پروگرام محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے اغراض ومقاصد (انگریزی)، ۱۹۴۷ء میں شائع کر چکے تھے۔ یہاں انہوں نے اس مفصل پروگرام کا خلاصہ شامل کیا ہے

تمام مکاتبِ فکر کے ہاں قابل قبول ہوں، سے معلوم ہونے والے مجموعی احکام کو جمع کرے گی، اور خاص عناوین کے تحت ان کی ضابطہ بندی کردے گی۔ امید ہے کہ اس طریقے سے نسبتاً مختصر حجم کا ایک ضابطہ میسر آجائے گا، جسے مختلف مسلم مکاتبِ فکر کے درمیان ایک طویل ترین غیر فرقہ وارانہ قدر مشترک قرار دیا جاسکے گا۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو، ملت کے پاس معاشرتی اہمیت سے متعلقہ سوالات کے بارے میں ایک کم از کم شرعی ضابطہ مہیا ہوجائے گا، جو بعد میں مزید غور و فکر کی بنیاد اور عملی قانون سازی کے نقطۂ آغاز کا کام دے سکتا ہے"۔

میں آپ کی توجہ مندرجہ بالا بیان کے آخری جملے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس سے یہ بات واضح ہے کہ شرعی قوانین کی ان خطوط پر ضابطہ بندی بھی جن کی نشان دہی میں نے کی ہے، خود بخود معاشرتی قوانین کے ایک تیار ضابطے کے طور پر نافذ العمل نہیں ہوجائے گی۔ دراصل، یہ ضابطہ بندی ہمیں اپنے مستقبل کے معاشرتی قانون کی محض ایک بنیاد فراہم کرے گی، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ، اور ان شرعی ہدایات کو ایک عملی اور مفصل قانون سازی کی صورت میں ڈھالنا ہمارے اجتہادی عمل پر منحصر ہوگا۔ ظاہر ہے، اس عمل کے لیے حقیقی علماء کا میسر آنا شرط اولین ہوگا، جو نہ صرف شریعت کے سیاق و سباق سے واقف ہوں بلکہ عصری زندگی کے تمام پہلوؤں کو بھی جانتے ہوں۔ ایسے علماء، نادر الوجود ہیں، -ایک محتاط اندازے کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ -ہمارے معاشرے میں موجود نہیں ہیں: اس بنا پر ایک اسلامی دارالعلوم کے قیام کی شدید ضرورت ہے،

مولانا شبیر احمد عثانی

جو اس تقاضے کے مطابق علماء کو تربیت دے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بہت پہلے ہی، جنوری ۱۹۴۸ء، میں مغربی پنجاب کی حکومت کو ایک عصری دارالعلوم قائم کرنے کے لیے پلاننگ کمیٹی بنانے کی تجویز دے دی تھی۔ میری تجویز مان لی گئی تھی، اور عزت مآب سربراہ کی طرف سے مجھے اس کمیٹی کا اجلاس بلانے کا اختیار سونپ دیا گیا تھا۔ میں علماءِ کرام کو خواہ مخواہ مخالفت میں بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ میں نے اس کمیٹی کی صدارت مولانا شبیر احمد عثانی کو پیش کر دی جسے انہوں نے قبول فرمالیا۔ اسی مقصد کے لیے، مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد علماء کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا، البتہ میں نے اس میں جدید تربیت یافتہ علماء کو خاص جگہ دینے کا اہتمام کیا۔ کچھ غیر متعلقہ مشکلات کی وجہ سے اس موضوع پر کام شروع کرنا فی الحال ممکن نہیں ہوسکا۔

مزید آگے بڑھنے سے قبل میں یہاں ان فرائضِ منصبی کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ نے پورے کرنا تھے -اور جو کہ وہ پورے کر سکتا ہے، اگر حکومت اس کے بنیادی اغراض و مقاصد سے اتفاق کرے۔

اغراض و مقاصد اختصار کے ساتھ ایک مضمون بعنوان "اسلامی تعمیر نو" (عرفات، مارچ ۱۹۴۸ء، ص ۶- ۱۵) میں بیان کیے گئے تھے، مجھے امید ہے وہ پہلے سے حکومت کے علم میں آچکے ہوں گے۔ ان اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے محکمے نے چار شعبوں میں کام کرنے کا پروگرام بنایا:

(۱) **شعبۂ تحقیق:** اس شعبے کا بنیادی ہدف مندرجہ بالا "شریعت کمیٹی" قائم کرنا اور اس کی رہنمائی کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ، شعبے کا کام قانونِ اسلامی کی روشنی میں مخصوص سماجی اور معاشی سوالات کے مناسب اور واضح جوابات دینا ہوگا۔ اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں- جیسے ذاتی زمینوں اور جائدادوں کو قومیانے کا مسئلہ، اوراصل زر اور محنت کا آپس میں تعلق، بینکنگ اور انشورنس، وغیرہ وغیرہ جنہیں شریعت نے متعلقہ زمانے کے مطابق اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے، مگر ان کا مکمل حل تلاش کرنا ضروری ہے، اگر ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام تمام زمانوں اور ثقافتی ترقی کے تمام مراحل کے لیے قابل عمل ہے۔ جب تک ہم یہ دکھا دینے کے قابل نہیں ہوجاتے کہ اسلامی دستور العمل نہ صرف لوگوں کو روحانی اطمینان بخشے گا بلکہ وہ انہیں روٹی، مکان، سود، پیداوار دینے والا کام- خلاصہ یہ کہ، کم از کم معاشرتی تحفظ- بھی فراہم کرے گا تو اس کی روحانی تاثیر ختم ہوجائے گی اور میدان کمیونسٹ پروپیگنڈے کے لیے خالی ہوجائے گا۔ ہمارے مولوی صاحبان اب

تک صرف گزرے زمانوں کے حقائق پر خوشیوں کے شادیانے بجاتے رہے اور اسلامی خطوط پر معیشت کی تشکیل کے لیے کوئی ٹھوس تجاویز نہ دے سکے۔ ہمارے محکمے کا شعبۂ تحقیق قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک طرح کی لیبارٹری بن جائے، جس میں ہمارے وجود کے تازہ مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے جدید تحقیقی طریق کار کے مطابق حل پیش کیا جائے۔ ہمارے دائرۂ کار میں آنے والے سماجی مسائل میں سے ایک مسئلہ، "پردہ" ایک اہمیت کا مقام رکھتا ہے۔ امید ہے کہ ہماری تحقیق قرآنِ مجید اور اسوۂ نبی کریم ﷺ کی بنیاد پر یہ ثابت کر دے گی کہ پردہ اسلام کے معاشرتی نظام میں شامل نہیں ہے، اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں یقیناً وہ روبہ عمل نہیں تھا۔

(۲) **شعبۂ تعلیم:** یہ شعبہ اپنی توجہ زیادہ تر ایک جدید دار العلوم کے قیام اور اسے چلانے پر مرکوز کرے گا۔ تجویز یہ ہے کہ جو صاحب دارالعلوم کے پرنسپل ہوں، وہی بلحاظِ عہدہ محکمہ اِحیائے امتِ اسلامیہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی ہوں۔ شاید سب سے بہتر بات یہ ہو گی کہ اس منصب پر کسی ترقی پسند مصری محقق کا تقرر کیا جائے، جس نے جامعہ ازہر سے تعلیم حاصل کی ہو، ضروری وسعت نظر بھی رکھتا ہو اور اسے دنیوی امور پر بھی خوب عبور حاصل ہو، کیوں کہ اس بات میں ایک گونہ ابہام ہے کہ ہمارے اپنے علماءِ کرام میں سے کوئی مناسب صاحب مل سکیں گے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ حضرات ہو سکتا ہے بہت اچھی نیت کے مالک ہوں اور وسعت ظرف بھی رکھتے ہوں، مگر یہ طے شدہ ہے کہ وہ عصری زندگی کے مسائل سے واقف نہیں ہوں

جامعہ ازہر قاہرہ کا ایک منظر

گے۔ شعبۂ تعلیم کا دوسرا کام ہمارے تمام سکولوں اور کالجوں میں اسلامی تعلیم میں رابطہ قائم رکھنا ہو گا، اس کا مقصد اپنے پورے تعلیمی نظام میں صحیح اسلامی روح پھونکنا ہو گا۔ تعلیمی کانفرنس کی سفارشات بہت عمومی نوعیت کی ہیں، اور انہوں نے بہت وسیع اختیار صوبائی یونیورسٹی کمیٹیوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں دیگر مسلم ممالک کے تجربے سے بھی ضرور استفادہ کرنا ہو گا، خصوصاً مصر سے: اور ہمارا شعبۂ تعلیم پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے درمیان مستقل تعلقات بھی قائم کر سکتا ہے اور تعلیمی نقطہ ہائے نظر کا تبادلہ بھی کر سکتا ہے۔

(۳) **شعبۂ تبلیغ ونشرواشاعت:** اس شعبے کے فرائضِ منصبی واضح ہیں۔ یہ اخبارات، ریڈیو اور خطاب کے ذریعے صحیح اسلامی تصورات کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے گا۔ ہمارا اہم ترین مقصد اپنے ہم وطنوں کی معاشرتی خود اعتمادی / اجتماعی اخلاقیات کی تعمیرِ نو ہے، جو، ہماری معلومات کے مطابق اتنی گہرائیوں میں گر چکی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ میری رائے میں، بدعنوانی کے خاتمے اور اعلیٰ پیمانے کے سماجی تعاون کے لیے حکومت کے تمام اقدامات کی بنیاد اضطراب وبے چینی کی چٹانوں، تخیلات و توہمات اور اخلاقی بے حسی پر رکھی گئی ہے، جس میں ہماری قوم گری ہوئی ہے ، جس کی غالب وجہ حصولِ آزادی کے بعد لوگوں کو حکومت کی طرف سے کوئی واضح ہدف نہ دے پانا ہے، جس کے لیے وہ جدوجہد کرتے۔ واضح ہدایات پر مبنی جذبے اور عملی

مثالیت کے بغیر، قومیں حتمی طور پر اخلاقی اور سیاسی دونوں سطحوں پر بکھر جاتی ہیں: اس مسئلے کا ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے کہ، ہماری قوم کو یہ یقین ہو جائے کہ، حکومت پاکستان واقعتاً اسلامی خطوط پر ایک سیاسی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ میں اس موضوع پر بعد میں اسی یادداشت میں مزید گفتگو کروں گا۔

(۴) **شعبۂ اصلاحاتِ قانون سازی:** اس شعبے کا کام قانون سازی میں اسلامی خطوط پر اصلاحات لانے کے بارے میں حکومت کو واضح تجاویز دینا ہو گا۔ واضح سی بات ہے کہ ہم صرف ایسے معیارات کی تجویز دیں گے جن کا موجودہ حالات میں عملی نفاذ ممکن ہو گا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خیالی تجاویز نہیں دی جائیں گی جیسے کہ ہمارے مولوی صاحبان کی ترجیحات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ، آج کل ہم ایک "قانونِ زکوۃ" کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہیں جو، جب تیار ہو جائے گا، مرکزی حکومت کے غور کے لیے پیش کیا جائے گا۔ (وجہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ دستور کے مطابق، کوئی زکوۃ بل صوبائی اسمبلی پاس نہیں کر سکتی، خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ زرعی زمین کے علاوہ، جائداد اور سرمائے پر لگائے جانے والے تمام ٹیکس، وفاقی فہرست کے اندر شامل ہیں)۔ اس مسودے کی تیاری میں رابطہ کاری تو ایک بنیادی ضرورت ہے، اس کے علاوہ اس میں ان تمام مکتب ہائے فکر کی آراء شامل کی جائیں گی جو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے (أ) کہ مسلمانوں سے زکوۃ کی وصولی سے حکومت پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہو جائے گی کہ وہ اور کسی طرح کے ٹیکس عائد کرے، اور (ب) یہ کہ ایک اسلامی حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ حسبِ ضرورت کچھ خصوصی ٹیکس عائد کرے، اگرچہ یہ ٹیکس ان عناوین کے تحت ہی لگائے جائیں جن پر زکوۃ کے قانون کے تحت لگائے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا دو مسائل کا پوری مسلم تاریخ میں کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا، اور ہم اس معاملے میں ایک طرح سے قائدانہ کام کر رہے ہیں۔ (یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ، جملہ معترضہ کے طور پر، کہ اس مسودے کی بنیاد پر جو ہم اب تیار کر رہے ہیں، حکومت کو دیگر تمام ٹیکسوں کے علاوہ،

اضافی آمدن کے طور پر کئی کروڑ حاصل ہوں گے، جسے مسلم قوم اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرے گی، اور اس کا استعمال سماجی فلاح و بہبود کے اقدامات کے لیے کیا جا سکے گا، جیسے بے روزگاری الاؤنس، سماجی بیمہ اور فلاح و بہبود کے دیگر بہت سے اخراجات جو اب تک عام بجٹ میں سے اٹھانا پڑتے تھے)۔

مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم شریعت کو (اس لفظ کے وسیع مفہوم کے طور پر) یکدم نافذ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے بر عکس، مجھے یقین ہے کہ یہ کام صرف ایک منصوبے کے تحت تیار کردہ لائحۂ عمل کے مطابق کیا جا سکتا ہے جو کم از کم دس سال کی مدت پر محیط ہو گا۔ اس منصوبے سے متعلق ہمارے محکمے کا عمومی کام یہ ہو گا کہ وہ اسلامی قانون کے مسئلے کی ایک نئی، تعمیری سوچ تیار کرے گا، اور اس طرح اسے اپنے زمانے کے لیے ایک عملی دستور کار بنا کر پیش کرے گا۔ البتہ، ایک سرکاری محکمہ ہونے کی بنا پر، ہم امکانی طور پر اس وقت تک کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکتے جب تک حکومت یہ فیصلہ نہ کرے کہ اسلام کا قانون اس کی حکمتِ عملی کا تشکیلی عنصر ہو گا، اور پھر یہ فیصلہ ایک سرکاری بیان کے ذریعے عوام میں عام کرے۔ اس طرح میں اس یادداشت کے مرکزی نقطے پر پہنچ گیا ہوں۔

انتہائی اعلیٰ سطح پر کیے گئے بہت سے اعلانات کے باوجود کہ پاکستان کو قرآن کی روح کے مطابق چلایا جائے گا، بڑے پیمانے پر یہ تاثر پنپ رہا ہے کہ اس وعدے کی تکمیل کے لیے اب تک کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا گیا، اور یہ کہ، اس کے بر عکس، اس بات کے کافی شواہد مل رہے ہیں کہ حکومت اعلانیہ طور پر مغربی دنیا کے طرز پر دھیرے دھیرے "سیکولرازم" کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عام تاثر درست ہے یا نامکمل

معلومات کی بنیاد پر قائم ہوا ہے؛ مگر یہ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے حکمتِ عملی کے بارے میں ایک صاف اور واضح اعلان کے بغیر ہمارا محکمہ لوگوں کو اس بات پر مطمئن نہیں کر سکتا کہ "اسلامی تعمیرِ نو / محکمہ اِحیائے ملت اسلامیہ" کی حیثیت ایک تشہیری آلہ کار سے زیادہ بھی کچھ ہے۔

میں ذاتی طور پر یقین رکھتا ہوں- اور میں اس یقین پر ہر ممکن زور دے کر تاکید کرنا چاہتا ہوں- کہ نظریاتی ابہام جو ہماری آج کی زندگی کا ایک کردار بن چکا ہے، اس کا نتیجہ سیاسی بے چینی اور انتشار کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک سیاسی طور پر زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اصول پرستی کے ایک معین معیار اور جذباتی وحدت سے سرشار نہیں ہوتی؛ اور ہمارے معاملے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس طرح کی اصول پرستی اور اس معیار کی وحدت فراہم کر سکے، ہمارے لیے اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ ہم اسلام پر شعوری یقین رکھتے ہوں اور اسے ایک سیاسی حقیقت میں ڈھالنا ہماری خواہش ہو۔

ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے وہ لوگ جو پاکستان کے مستقبل کی تشکیل ایسے خطوط پر چاہتے ہیں، مثال کے طور پر کہہ لیجیے کہ: ترکی کی طرز پر، تو وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے (نہ ہی، غالباً اپنے آپ کو) کہ اگر اسلام کو ہمارے معاشرے کی تعمیر میں ممتاز حیثیت نہیں دی جاتی تو پاکستانی "قومیت" کی بنیاد کیا ہوگی۔ ترکی یا برطانیہ کی مثال، یا حتی کہ عرب ریاستوں کی مثال ایک ایسے ملک کے لیے مناسب نہیں جیسا ہمارا ملک ہے: کیوں کہ، ان تمام ریاستوں میں یا تو زبان کی بنیاد پر ایک بہت بڑی ہم آہنگی ہے، یا نسلی بنیاد پر، اور اس بنیاد پر وہ ہر تاریخی اور ثقافتی مفہوم میں "قومیں" ہیں، جب کہ پاکستان کے معاملے میں اس ساری بیرونی ہم آہنگی کا عنصر سرے سے موجود ہی نہیں (جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لفظِ "قوم" کے روایتی مفہوم میں ایک قوم نہیں ہیں)۔ اگر ہم اس معاملے کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیں، بے کار کے حیلوں بہانوں کے بغیر، تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہاں کونسی بنیاد ہے؟، ان کے اسلامی شعور کے علاوہ، جو پنجابیوں، پٹھانوں، بنگالیوں اور سندھیوں کے تمام کے مختلف طبقات کو یکجا کر کے ایک مضبوط قومی وحدت میں سمو دے۔ ہمارا تعلق مختلف نوعیت کی نسلوں سے ہے، ہم مختلف زبانیں بولتے ہیں- اگر چہ، اردو غالباً ایک نہ ایک دِن ہم سب کی مشترکہ زبان بن جائے گی، پھر بھی وہ اصل مادری- زبان تو ان تمام گروہوں میں سے کسی کی بھی نہیں ہے، جو اس ملک کے باشندے ہیں۔ مختصر یہ کہ، ہمارے پاس نسلی شعور یا لسانی روایت کی وہ وحدت نہیں ہے جو دوسری قوموں کی "قومیت" کو تشکیل دیتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہم اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں- یا، اس کی بجائے یہ کہ، ہم ایک قوم ہیں- اس کی جڑیں کسی اور چیز میں ہیں: اور یہ کہ وہ اور چیز ہمارا یہ شعور ہے کہ ہم ایک نظریاتی گروہ ہیں۔ اسی نے، اور اس کے علاوہ کسی چیز نے نہیں، پاکستان کے قیام کا جذباتی اور عقلی جواز مہیا کیا ہے۔ اگر اسی شعور کو صحیح طور پر پُر عزم منصوبہ بندی کے ذریعے پروان چڑھایا گیا اور اس کی تعمیر کی گئی تو یہی پاکستان کو عظیم، طاقت ور اور ثابت قدم بنا دے گا؛ اور اگر ہم نے اسے نظر انداز کیا اور مغربی نظریات کی نقل کرتے ہوئے اسی بحث میں پڑے رہے کہ ایک جدید ریاست میں "کیا کرنا چاہیے" اور "کیا نہیں کرنا چاہیے"، تو ہم اتنی جلدی قومی سانحے سے دوچار ہو جائیں جتنا ہم میں سے بہت سوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔

احکامِ اسلام پر عدم رضامندی کا رویہ جس کی بنا پر ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اس کے پاکستان میں نفاذ کی مخالفت کرتا ہے، کوئی بہت معقول رویہ نہیں ہے (اگرچہ ہمارے مولوی صاحبان نے دنیا کو اسلام کی بالکل مبہم تصویر دکھا کر یقیناً اس سلسلے میں بہت نقصان پہنچایا ہے)، باوجود اس حقیقت کے کہ جدید دنیا میں کسی جگہ بھی اسلام مؤثر طریقے سے نافذ نہیں ہے۔ انہیں ساری کی ساری فکر اس بات کی ہے کہ باہر کی دنیا کی نظروں میں وہ کہیں قدامت پسند شمار نہ ہوں، چناں چہ جب بھی ان سے کوئی شخص اس موضوع پر بات کرتا ہے، تو ان کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ، "کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ شریعت کی بنیاد پر قانون سازی مصر یا ترکی میں بھی کہیں نافذ ہے؟"- پھر ان کی توقع یہ ہوتی ہے کہ، انہیں جواب نفی میں

ملے گا اور اس سے دلیل ان کے حق میں ثابت ہو جائے گی۔ دیگر تمام پہلوؤں سے قطع نظر، یہ رویہ تعمیری سوچ کی کمی کا ایک جھنجھوڑ دینے والا مظاہرہ ہے۔ مصر اور ترکی اور دیگر تمام مسلم ریاستیں، پاکستان کی طرح عوام کی طرف سے ایک شعوری نظریاتی مطالبے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آئیں۔ ان کا قیام بعض صورتوں میں اصل اسلامی سلطنت ٹوٹنے کا نتیجہ تھا اور بعض دیگر صورتوں میں، بعد کے زمانوں میں مسلم فتوحات کا نتیجہ: اور ان میں سے ہر صورت میں نئی ریاستیں پہلے سے موجود، مخصوص نسلی یا قومی شناخت کی بنیاد پر قائم ہوئیں۔ اس طرح، وہاں کے باشندوں کی قومی شناخت ہی اب ان ریاستوں کی سیاسی بقا کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، ایک ایسی شناخت جس کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ شعوری طور پر اور مؤثر طور پر اسلام کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو، بہر حال، ہمارے لوگوں کی "قومی" شناخت کا وجود اور عدم وجود ان کے نظریاتی شعور پر منحصر ہے - جو کہ، اسلام ہے۔ ہم اپنے مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک قوم ہیں، کسی بھی اور وجہ سے نہیں؛ بیرونی دنیا کو یہ بات پسند ہو یا نہ ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے خود مختار ریاست اس خواہش کے علاوہ کسی اور بنیاد پر حاصل نہیں کی کہ ہمیں اسلامی نظریے کے لیے ایک وطن میسر آجائے۔

"پاکستانی حب الوطنی" کی ضرورت پر جس قدر بھی زور دیا جائے، ممکنہ طور پر اس سے قومی وحدت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا، جب تک ان جذباتی عوامل کو سامنے نہ رکھا جائے، صرف جن کی بنا پر حب الوطنی پنپ سکتی ہے۔ دوسری مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کا جہاں تک تعلق ہے، تو ان میں قومی ہم آہنگی کے جذبات یقیناً نسلی اور تاریخی وحدت کے شعور سے پیدا ہوتے ہیں، وہی اپنے لوگوں کو تحریک دیتے ہیں، وہی ہیں جو ایک ترک کو ترک ہونے کا شدت سے احساس دلاتے ہیں، ایک عرب کو عرب ہونے کا، اور ایک انگریز کو انگریز ہونے کا: اور اس طرح - اس سوال سے بالکل بے گانہ ہو کر کہ یہ چیز اخلاقاً صحیح ہے یا غلط - ان کی قومیت انہیں حب الوطنی کی بنیاد فراہم کر سکتی ہے، اور کرتی بھی ہے۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ صرف اور صرف ہمارا ایک مشترکہ نظریے کے ساتھ مضبوط تعلق ہی پنجابی اور بنگالی کے درمیان اور اسی طرح پٹھان اور سندھی کے درمیان تعلق کا ذریعہ بنتا ہے، اسی میں ضروری جذباتی طاقت ہے جو ہمیں جوڑ کر ایک قومی وحدت میں پرو سکتا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا، جو کہ ہماری قومی وحدت کا عنصر ہے، اور پھر یہ توقع کرنا کہ، ہماری سیاسی خود مختاری کے حصول کے بعد، اسلام کو پیچھے کر کے محض "پس منظر کی سُروں" کا درجہ دے دینا - ایک ایسا درجہ جو مذہب کے لیے دوسرے ممالک میں قابلِ قبول ہے - ایک بہت بڑی غلطی ہو گی: کیوں کہ اس طرح کی توقع پاکستان کو سوائے اس کے اور کہیں نہیں لے جائے گی کہ وہ داخلی انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر، ہمارا ملک بری طرح صوبائیت کی روح کا شکار ہے، جو ہمیں زمانۂ ماضی سے ورثے میں ملی۔ مکمل داخلی وحدت کی طرف اس عظیم پیش قدمی کے باوجود جو ہم نے پاکستان کے لیے اپنی جدوجہد کے دوران کی، ہمارے ہم وطن ابھی تک اپنے آپ کو پنجابی، سندھی، پٹھان اور بنگالی محسوس کرتے ہیں، اور کئی موقعوں پر وہ قومی وحدت کے مفادات کے مقابلے میں اپنے علاقائی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ اور کیا چیز ہے جو ذاتیت کے اس باریک خلا کو پُر کر سکتا ہے؟

اسلام کے علاوہ اور کیا ہے جو پٹھانوں کی "پٹھانستان" بنانے کی خواہش کو مغلوب کر سکے یا بنگالیوں کی اردو کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنے سے نفرت کو ختم کر سکے؟ اگر آپ انہیں دس لاکھ دفعہ بھی کہیں کہ حب الوطن بن کر رہیں یا ریاستی وحدت کے مفادات کو سب سے مقدم رکھیں، تو

آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، جب تک کہ آپ آہستہ آہستہ انھیں یہ شعور ذہن نشین نہ کروادیں کہ ان کا تعلق ایک فطری وحدت کے ساتھ ہے: اور یہ احساس صرف ان کے اندر یہ شعور گہرا ہونے کی صورت پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق ایک مشترکہ نظریاتی طبقے سے ہے، اور ان کا یہ اعتماد کہ یہ مشترکہ نظریہ-اسلام-ہی ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے خدوخال متعین کرنے میں فیصلہ کن عنصر ہوگا۔

اگر کچھ اور نہیں، پاکستان کی خالصتاً مفادات پر مبنی، دنیوی دلچسپیاں تعین کے ساتھ یہی تقاضا کریں کہ اسلامی نظریے کو ہمارے سیاسی نظام کی تشکیل میں مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے، تو یہ بات ثابت شدہ ہے کہ، اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں جو پاکستان کے بے جوڑ عناصر کو یکجا رکھ سکے: اسی طرح اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں جو اس ملک کو اور دیگر مسلم دنیا کو مؤثر طریقے سے ایک ساتھ رکھ سکے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جو بلا شبہ ہر پاکستانی کے ذہن میں اہم ترین مقام رکھتا ہے۔

غیر مسلم اقوام کے آج کی مسلم دنیا کو متاثر کرنے والے دو دہکتے سلگتے مسائل کشمیر اور فلسطین کے بارے میں رویے نے بالکل واضح طور پر یہ دکھا دیا ہے کہ اپنے دائرے سے باہر مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں ہے۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا ہے، مغربی دنیا کی ہمدردیاں ترجیحی بنیادوں پر غیر مسلموں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں فلسطین ایک مثال ہے؛ ریڈکلف ایوارڈ مسلم مفادات کے خلاف ان کے فطری رویے کی دوسری مثال تھا۔ مغربی سیاست دان یہاں تک تیار رہتے ہیں-جیسا کہ سوویت روس اور امریکا نے فلسطین کے معاملے میں کیا-مسلم دنیا کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کے لیے عارضی طور پر اپنے اختلافات دبا دیا کرتے ہیں۔ اس بنا پر، یہ واضح ہے، کہ مسلم اقوام اس وقت تک اپنا سیاسی وجود برقرار رہنے کی امید نہیں رکھ سکتے جب تک وہ ایک دوسرے کے قریب نہ ہو جائیں، اپنے وسائل کو یکجا نہ کرلیں اور بروقت ایک سیاسی وحدت میں جمع نہ ہو جائیں: ایک رابطہ مسلم اقوام۔ ان کی یکجا شدہ رجالِ کار کی استعداد اور معاشی وسائل دیگر مشترکہ سیاسی گروہوں کے دباؤ کے مقابلے میں جم کر رہنے کے لیے کافی ہوں گے، بلکہ امید ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں جو مخالف فریقوں میں بٹ چکی ہے، یہ جمع شدہ وسائل اس میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بھی کافی ہوں گے: جب کہ، دوسری طرف، اگر مسلمان سیاسی طور پر اسی طرح بے جوڑ ٹکڑوں میں بٹے رہے تو جیسے کہ اب ہیں، تو ایسی کوئی چیز نہیں جو ان کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت دے سکے۔

تقسیم ہندوستان کی ریڈکلف لائن کا نقشہ

ہماری مشترکہ بصیرت اور اپنے تحفظ کے فطری شعور کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلم دنیا متحد ہو جائے، اور یہ صرف اسلام کی دعوت ہی ہے جو وحدت کے لیے جذباتی بنیادیں فراہم کر سکتی ہے۔ اگر ہم، پاکستانی قوم، اسلام کو اپنے سماجی اور سیاسی وجود کے لیے بنیادی عنصر بنانے کے معاملے میں انتشار کا شکار ہو جائیں، تو ہمارے درمیان اور دوسری طرف سے عربوں، افغانیوں اور ایرانیوں کے درمیان کوئی خاص قدر مشترک نہیں رہ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر ہم، اسلامی دنیا کی سب سے بڑی ریاست، ایک صحیح اسلامی نظریاتی نظام سیاست تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو پوری اسلامی دنیا کو اس مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے ایک عظیم حوصلہ مل جائے گا، اور ہم میں سے بہت سے لوگ سیاسی وحدت کا خواب جتنی مدت میں پورا ہوتا دیکھ رہے ہیں، اس سے کہیں جلدی یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ایسے میں قیادت یقیناً پاکستان کے ہاتھ میں ہوگی: نہ صرف اس لیے کہ ہم مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارا بطورِ ریاست قیام ہی اسلام کے لیے ہماری شعوری خواہش کا نتیجہ ہے، اور اس لیے بھی کہ ہم نے-جدید مسلم دنیا میں سے صرف اور صرف ہم نے-وہ نظریہ قائم کیا جس کی بنا پر مسلم وحدت کا حصول ممکن ہو سکتا ہے، جو کہ ہماری سیاسی فکر اور جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔

فطری سی بات ہے، کوئی شخص، یہ دلیل بھی پیش کر سکتا ہے (اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے لوگ ان خطوط پر بحث کرتے بھی ہیں) کہ اسلامی نظریے پر علی الاعلان زور دینے سے غیر مسلم دنیا کا بغض بھڑک اٹھے گا اور وہ ہمارے لیے خارجہ پالیسی میں مشکلات پیدا کریں گے، جب کہ

اپنی ریاست کے "اسلامی" کردار پر زیادہ زور نہ دے کر ہم اس سے پہلو تہی کر سکتے ہیں۔ یہ دلیل، میں عرض کرتا ہوں کہ، مکمل طور پر مغالطے پر مبنی ہے۔ ہم اپنے اسلامی کردار پر زور دیں یا نہ دیں، غیر مسلم دنیا کو یہ بات واضح ہے کہ ہمارا ہدف اسلامی حکمت عملی ہی ہے؛ اس کی وجہ سادہ سی ہے، اور وہ یہ کہ دنیا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر رہی اور نہ کر سکتی ہے کہ روزِ اول سے ہی ہم نے ایک الگ ریاست کے لیے اپنے دعوے کی بنیاد ہی اپنے مسلمان ہونے پر رکھی تھی، اور اپنے اس عزم پر کہ ہم اپنی قومی زندگی اسلامی نظریے کے مطابق تشکیل دیں گے۔ حتی کہ، اگر اپنی خارجہ پالیسی کے مفاد میں، ہم اپنے اسلامی منصوبوں اور پروگراموں کے حوالے سے ہم انتہائی دور اندیشی کے کام لینے کے خواہش مند بھی ہوں، تب بھی بیرونی دنیا کو یہ یقین رہے گا کہ ہمارا مقصد اسلام ہے ، اور وہ ہماری "دور اندیشی" کو منافقت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھیں گے (جو کہ، ویسے، ہوگی بھی)۔ یہ بات طے ہے کہ ہم اپنے اسلامی مقاصد کے اعلانیہ اظہار کو روک کر بھی ہم مزید دوست نہیں بنا سکیں گے، اور اسی کے برابر، یہ بات بھی طے ہے کہ ہم ایسا کر کے دوسری مسلم اقوام کے ساتھ اپنی دوستی کو کمزور کر لیں گے۔ اور جہاں تک داخلہ پالیسی کا تعلق ہے، تو اس طرح اسلامی مقاصد کو دبانا خطرناک ہو سکتا ہے۔

اسلامی حکمتِ عملی کے حق میں اپنے موقف کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ، کسی ابہام کے بغیر اعلانیہ بیان کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ پاکستان کو اس وقت جن بھاری معاشی مشکلات کا سامنا ہے -اور جن کا حل کسی اچھے طریقے سے نکالنا ممکن نظر نہیں آرہا- ان کی وجہ سے یہاں اشتراکیت کو پھیلنے کے لیے زرخیز زمین میسر آسکتی ہے۔ یہ کہ اب تک اس ملک میں اشتراکیت کی پیش قدمی جو محدود رہی ہے وہ حتمی طور پر ہمارے لوگوں کے اسلام کے ساتھ گہرے تعلق کی وجہ سے ہے، اور ان کے اس یقین کی وجہ سے کہ اگر یہاں اشتراکی نظام قائم کر دیا گیا تو قرآنِ پاک کی ہدایات کی بنیاد پر معاشرتی اور معاشی نظام قائم کرنے کی تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ، اگر ہماری ریاست کو "سیکولرازم" کی طرف کھسکنے کی اجازت دے دی گئی تو ہمارے اسلامی شعور کی کمزوری کا امکان بڑھ جائے گا، اور مارکسی پروپیگنڈے کے سامنے تمام دروازے کھل جائیں گے۔ اسی طرح، جو نظریاتی تذبذب لوگ اس وقت محسوس کر رہے ہیں، اشتراکیت کے داعی اسے پوری طرح استعمال کر رہے ہیں، اور بڑی چالاکی سے ہمارے لوگوں کے روحانی اور سماجی اضطراب کو اپنے نظریے کی خدمت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اب اشتراکیت کا، جیسے
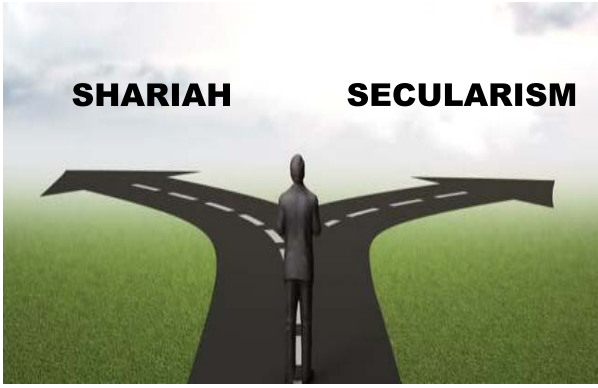
کہ ہم سب جانتے ہیں، طویل عرصے تک طاقت سے کامیاب مقابلہ نہیں کیا جا سکتا: اس کا مقابلہ صرف اس کے برابر کے یا اس سے زیادہ جاذب نظریے سے کیا جا سکتا ہے ، ایک نظریہ، جو کہ، معاشی انصاف اور مساوات کے اصولوں کو انسان کی ذاتی شناخت کی فطری خواہش اور روحانی تسکین کے ساتھ یکجا کر دے۔ ایسا نظریہ اسلام ہے، صرف اسلام، جو کہ ان تقاضوں کا جواب مہیا کر سکتا ہے۔

اس طرح، اسلام کو ہماری حکمت عملی کا غالب عنصر بنانے کی حمایت کے لیے بہت زیادہ مواد میسر ہے۔ اور اسلام سے میری مراد چند رسمی اور بے جان تقریبات نہیں ہے جن کی وکالت ہمارے پیشہ ور "حامیانِ اسلام" کرتے ہیں، بلکہ میری مراد زندہ، جاری نبض والا اور مکمل طور پر وقت کے تقاضوں پر پورا اترنے والا پیغام ہے جو قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی مثال نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود ہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف اس شریعت کا نفاذ نہیں ہے جو گزشتہ صدیوں کی روایتی اور زمانے سے محدود فقہ میں ہے: کیوں کہ اس کا مطلب اس جمود کو دوام بخشنا ہوگا جس کی قید مسلم فکر صدیوں سے کاٹ رہی ہے، اور طاقت اسی طبقے کے ہاتھ میں دینا ہوگا جو گزرے زمانوں میں ہماری ثقافتی پس ماندگی کے ذمہ دار تھے۔ اسلام کے بغیر ہمارا گزارا نہیں- البتہ وہ اپنی دائمی تروتازگی کے ساتھ اصل اسلام ہونا چاہیے، مری ہوئی بے معنی تقریبات کا ایک بوجھ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں، ہماری سیاسی فکر اور عمل کے حوالے سے اسلام کے تعارف میں اسلامی قانون کے مسئلے پر ہمارے نقطۂ نظر کی ایک تخلیقی تعبیرِ نو بھی شامل ہے۔

یہ، مختصراً، وہ پس منظر تھا جس کی بنا پر محکمۂ احیائے ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش ہوا۔

مگر، جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا، یہ محکمہ اس وقت تک صحیح طریقے سے کام نہیں کر سکتا جب تک حکومتِ پاکستان اسلام کے معاملے میں اپنی

پالیسی واضح نہیں کر دیتی۔ اگر ہم ایک متعین نظریاتی مقصد کے بغیر گھسٹتے رہے، تو پاکستان کی وحدت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہم اپنے سیاسی وجود کا واحد بندھن ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے جو جذباتی طور پر ہماری وحدت کا ضامن ہے۔ ان حالات میں حکومت کی اصل پالیسیوں سے طلاق یافتہ ایک محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ اسلامی روح کی نشاۃ ثانیہ اور ملی اخلاقیات کی ترویج کا ایک تسلسل کے ساتھ راگ الاپتا بھی رہا اس سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔

ضرورت - اور انتہائی فوری ضرورت - اس بات کی ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے ایک غیر مبہم بیان جاری ہو کہ ایک اسلامی نظم ریاست کا قیام، قبل تقسیم کا محض ایک نعرہ نہیں تھا اور نہ ہی انتخابات جیتنے کا آلہ کار تھا، بلکہ وہی قیام پاکستان کا اصل مقصد تھا۔ ہمیں اس معاملے میں مغربی لوگوں کی آراء سے متاثر نہیں ہونا چاہیے جو صرف ایک "سیکولر" ریاست کو ہی دور جدید سے مطابقت کی علامت سمجھتے ہیں؛ نہ ہی، یقینی طور پر، ہمیں اپنے تئیں یہ سمجھنا چاہیے کہ "پاپائیت / ملائیت" کی طرز کی ایک ریاست جسے ہمارے کوئی مولوی صاحب چلا رہے ہوں، اسلام کی حقیقی علامت ہو گی۔ یہ لوگ رجعت پسند ہیں: جب کہ اسلام مکمل طور پر ترقی پسند ہے۔ یہ لوگ مردہ فکر - قدیم، زمانے سے مقید فقہی فارمولوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں: مگر ہم نے اپنی زندگی کی تعمیر شارع کے معتبر مقاصد کے مطابق کرنی ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے، تو پاکستان بنانے میں کوئی معقولیت نہیں رہ جاتی۔

آج حکومت اپنے عوام کے دِل کی گہرائیوں کی خواہش کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہی ہے۔ مگر ان کی نظریں حکومت پر جمی ہوئی ہیں۔ انہوں نے برطانوی بیوروکریسی کی وارث ہونے کے طور پر گزشتہ کئی مہینوں میں اسی کی طرف دیکھنا سیکھا ہے، اور ان کی اصل امیدیں مردہ ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی خواہش نظریاتی معنویت کی حامل قیادت ملنے کی تھی، مگر انہیں وہ مل نہیں سکی۔ حکومت کے پاس اب بھی وقت ہے کہ لوگوں کو وہ کچھ دے دیں جو کچھ وہ چاہتے ہیں، اور اس طرح ان کے دِل دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیں۔ "سوتے ہوئے کتوں کو لیٹا رہنے دو" کی پالیسی جو اب تک حکومت نے اسلامی پالیسی کے سوال پر اپنائی ہوئی ہے، زیادہ دیر کام نہیں کر سکے گی: کیوں کہ وہ سچ مچ سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ کوئی اسے پسند کرے یا نہ کرے، اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں لوگوں کی فریادیں اور دہائیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائیں گی، اور حکومت کی طرف سے کوئی تعمیری رہنمائی نہ ملنے پر آہستہ آہستہ انتشار کی شکل اختیار کر لیں گی۔ مایوسی کے عالم میں، عوام روز بروز تاریک سوچ کے مالک قائدین کے چنگل میں پھنستے چلے جائیں گے اور اس کے نتیجے میں ان میں قدامت پسندانہ رجحانات مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔ آج کل کی زندگی کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے پیشہ ور علماءِ دین کی بالادستی (جن سے ایسے حالات میں بچنا ممکن نہیں) کا نتیجہ معاشی تعطل، سیاسی تذبذب اور پاکستان کی معاشرتی زندگی میں پست ہمتی میں اضافے کی صورت میں نکلے گا۔ ایسی بد نظمی میں جو تعطل کی مندرجہ بالا صورتوں، اس تذبذب اور اس پس ہمتی کے بعد پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے، اشتراکیت امکانی طور پر غالب آ جائے گی، اور ہمارا خود مختار پاکستان تاریخی یادوں کے مراحل سے گزرے گا۔[4]

4- اقبال، بزم اقبال کا سہ ماہی مجلہ، جلد ۴۵: شمارہ: ۳، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳

دوروزہ ورکشاپ-بین المذاہب وسماجی ہم آہنگی

منعقدہ 6,7 جنوری، 2017، مارگلہ ہوٹل، اسلام آباد

زیر اہتمام: ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان (ایچ ای سی) اور سیرت چیئر، یونیورسٹی آف پشاور

ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان (ایچ ای سی) اور سیرت چیئر، یونیورسٹی آف پشاور کے زیر اہتمام ۶,۷ جنوری ۲۰۱۷ کو اسلام آباد میں دوروز پر مبنی ایک قومی مشاورتی ورکشاپ منعقد ہوئی، جس کا عنوان Consultative Workshop on Interfaith and Communal Harmony تھا۔ بین المذاہب و سماجی ہم آہنگی کے لیے منعقدہ اس مشاورتی ورکشاپ میں ملک بھر کی جامعات اور اداروں کے چنیدہ عہدیداروں، اساتذہ، ماہرین اور محققین نے شرکت کی جن میں خورشید احمد ندیم، ڈاکٹر حسن الامین، ڈاکٹر فیروز شاہ کھگہ، عمار خان ناصر اور ڈاکٹر دوست محمد خان قابل ذکر ہیں۔

ورکشاپ کی افتتاحی تقریب کی صدارت ایچ ای سی کے چیئرمین جناب پروفیسر ڈاکٹر مختار احمد نے کی جبکہ منصوبہ بندی اور ترقیات کے وفاقی وزیر جناب پروفیسر احسن اقبال اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔

ورکشاپ میں مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے افتتاحی کلمات میں سیرت چیئر، پشاور یونیورسٹی کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب نے دوروزہ مشاورتی اجلاس کا ایجنڈا اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ وفاقی وزیر جناب پروفیسر احسن اقبال اور ایچ ای سی کے چیئرمین جناب پروفیسر ڈاکٹر مختار احمد نے سیرت چیئرز کے قیام کا پس منظر بیان کیا اور بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے حکومتی عزم اور آئندہ پروگرام پر روشنی ڈالی۔

محترم احسن اقبال صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"سب سے پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آج ایک اور پراجیکٹ جو کہ ہمارا خواب تھا یا ایک وژن تھا کہ اس پر کام کیا جائے، وہ حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ امت مسلمہ اپنی ترکیب اور حقیقت میں بہت مختلف ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کیمسٹری دی ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ومرتبہ اس توانائی کی مانند ہے کہ جسے اگر کسی وجود سے نکال لیا جائے تو وہ پورا وجود ساقط ہوجاتا ہے اور وہ پورا وجود اپنا معنی کھو بیٹھتا ہے۔ دین اسلام کے اندر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ومقام ایک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو سمجھنا ہو تو قرآن مجید کی اس آیت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلایا کہ میں اور میرے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی درود بھیجو۔ اگر آپ اس آیت کے معنی پر غور کریں تو آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ خالق اور مالک اور اس کی تخلیق کے درمیان کبھی برابری نہیں ہو سکتی۔ جو کام مالک کے کرنے کے ہوتے ہیں وہ غلام نہیں کرتا، دونوں کا دائر کار مختلف ہوتا ہے اور جو رب کائنات ہے، جس ہستی نے تخلیق کیا، اس قوت ا ور ہستی کے مقابلے میں ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کسی عمل کی پیروی کرسکیں یا اس کو ہم دہرا سکیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا وہ عمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خدائی عمل کے اندر اپنے مخلوق کو شریک کیا اور کہا کہ میں بھی یہ عمل کرتا ہوں اور تم بھی یہ عمل کرو۔ فقط یہ ایک نقطہ ہمیں یہ بات سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان اور ان کا کیا مرتبہ ومقام ہے۔ اور اسی نقطے کو علامہ اقبال نے بہت سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

آپ امت مسلمہ کی تاریخ پہ نظر ڈالیں کہ جب تک ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو درست سمجھ کر اور صحیح روح کے مطابق سمجھ کر عمل کرتے رہے تو دنیا میں ہمیں عروج حاصل رہا اور جب ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے روگردانی شروع کی تو ہم زوال کی طرف جانے لگے اور ہمارا سفر بلندی سے پستی کی طرف تیزی سے رواں دواں ہوتا گیا۔ آج بھی جب ہم اپنی زبوں حالی کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات بہت واضح ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہم نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کردیا اور اسی بات کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ہرطرف سے دنیا میں پستی کا سامنا ہے۔ آج اگر ہم نے اپنا مستقبل بنانا ہے اور دوبارہ خود کو اس مقام پر فائز کرنا ہے جو کہ ہمارا حق ہے تو ہمیں اپنی بنیادوں کو ٹھیک کرنا ہوگا اور ان بنیادوں میں مسلمانوں کے پاس ہدایت کے دو ہی ذرائع ہیں: یعنی قرآن وسنت، ہم نہ قرآن کو سمجھتے ہیں، اسی طرح ہماری زندگی قرآن کی ہدایت سے فارغ ہوگئی اور نہ ہی ہم سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ جب ان دونوں ذرائع سے ہم ہٹ گئے تو پھر ہمارا وہی حال ہوگا جو آج ہے۔

اس پر جو ایک اور سانحہ ہوا کہ نائن الیون کے بعد مسلمان معاشرے دو رویوں کی زد میں آگئے۔ایک رویہ وہ جس نے ہمیں بہت معذرت خواہ کیا اور ہم سب اپنی شناخت،اپنی پہچان کے حوالے سے شرمندہ ہوگئے۔اگرچہ جو کچھ دنیا میں دہشت گردی کے نام پر ہوا اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے،یہ ایک اقلیت ہے جو اپنے سیاسی ایجنڈوں کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتی ہے،ان کے ایجنڈے مذہبی نہیں ہیں وہ سیاسی ہیں اور ان سیاسی ایجنڈوں کے لیے انہوں نے مذہب کا نام استعمال کیا اور اسلام کو دنیا کے سامنے بدنام کیا۔لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشروں کے اندر بھی ایک شرمساری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔دوسری طرف مغرب سے بھی ایک یلغار ہوئی جس نے مسلمانوں کے ذاتی تشخص کو مزید دھکیل دیا۔

کہتے ہیں کہ کسی بھی وجود کے لیے بدترین بیماری یہ نہیں ہوتی کہ اسے کوئی عارضہ لاحق ہوجائے،بد ترین بیماری یہ ہوتی ہے کہ وہ احساس کے بحران میں مبتلا ہوجائے،وہ اپنے وجود کے احساس سے محروم ہوجائے۔پھر آپ کے پاس جتنی مرضی توانائی ہو،آپ کے پاس جتنے مرضی وسائل ہوں وہ سب بیکار ہوجاتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے ممالک میں اور ہمارے معاشروں میں ایک احساس کا بحران پیدا ہوا ہے کہ ہم کون ہیں ؟ ہمارا وجود کیا ہے ؟ ہماری شناخت کیا ہے ؟ ہم ٹھیک راستے پہ ہیں کہ غلط راستے پہ؟ ٹھیک راستہ کیا ہے ؟ کون سا ٹھیک نہیں ہے ؟ یہ سب کچھ اتنا دھندلا گیا ہے کہ ایک یہ آواز اٹھنی شروع ہوگئی کہ جناب یہ مذہب تو ہے ہی فساد کا سبب۔ اس لیے ہمیں سیکولر پاکستان بنانا چاہیے۔پاکستان کو اگر بچانا ہے تو سیکولرازم کے ذریعے ہی ہم بچ سکتے ہیں اور اس میں اس مکالمے کو فروغ دینے میں بڑی حد تک ہماری اس مذہبی قیادت کا بھی دخل ہے کہ جنہوں نے مذہب کو آج کے اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کیا اور ان کا جو بیانیہ ہے ان کی جو گفتگو ہے،وہ اکیسویں صدی کے نوجوان یا اکیسویں صدی کے ذہن کو مطمئن نہیں کرسکتے۔وہ جو کتابیں پڑھ کر نوجوانوں سے مکالمہ شروع کرتے ہیں وہ غالباً گیارہویں، چودھویں، پندرہویں یا اٹھارہویں صدی کے لیے لکھی گئی تھیں جو اس دور کے لیے بہت مستند تھیں،لیکن اکیسویں صدی میں آج کے دور کے جو سوالات ہیں،ان کا وہ جواب نہیں دے پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو جدید نوجوان کا ذہن ہے،وہ سمجھتا ہے کہ اسلام شاید میرے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔اور یہ ایک مذہب کی حد تک تو ٹھیک ہے،میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے لیکن اس سے باہر دیگر نظریات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور اس کی بڑی وجہ جیسے میں نے کہا کہ ہم نے اپنے مذہب اور سیرت النبیؐ کو آج کے حالات کے مطابق پیش نہیں کیا۔اس پر تحقیق نہیں کی۔حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ایمان کا حصہ ہے،لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑ کر ہلڑ بازی کا لائسنس بنا دیا ہے کہ سڑکوں پہ جاؤ،جاکر سرکاری املاک کو توڑو،لوگوں کے املاک کو توڑو اور مار پیٹ کرو اور حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چیمپئن بن جاؤ۔یہ حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے،حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھیں،ان پر عمل کریں اور امت مسلمہ کو اس قیادت کے منصب پر فائز کریں جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے وعدہ لیا تھا۔

اسی لیے ہم نے سوچا کہ جب ہم ایک وژن ۲۰۲۵ء کے تحت قوم کی تعمیر کے لیے مختلف کوششیں کر رہے ہیں،اس میں معیشت پر کام کررہے ہیں،توانائی پر کام کررہے ہیں،تو قوم کی اخلاقی اور روحانی تربیت بھی قومی ترقی کا حصہ بن جاتی ہے۔کسی قوم کی ترقی کو آپ صرف سڑکوں،نالیوں،شاہراہوں اور بجلی کے منصوبوں تک محدود نہیں کرسکتے۔قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرتی جب تک کہ

اس کے وجود میں اس کی روحانی اور مادی دونوں صلاحیتیں شامل نہ ہوں۔ **اس مقصد کے لیے میں نے ہائیر ایجوکیشن کمیشن کو کہا کہ ہمیں سیرت چیئرز (chairs) قائم کرنی چاہیے** کہ جو آج کے حالات کے مطابق جدید تقاضوں اور تحدیات کا مقابلہ کرنے کے لئے سیرت سے رہنمائی لیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ہمیں ان سوالات کا جواب فراہم کریں جو آج کے جدید ذہن کے اندر پیدا ہورہے ہیں۔ جب تک ہمارے پاس وہ موتی ہیں، وہ خزانے ہیں کہ جنہیں اگر ہم انسانیت کے سامنے پیش کریں تو تمام دیگر مذاہب کے افراد دنگ رہ جائیں گے کہ ہمارے پاس کتنا خزانہ ہے۔ لیکن ہم اس پر نہ عمل کرتے ہیں اور نہ اس کو پیش کرتے ہیں۔ اس لئے بہت چن کر ان شعبوں کا انتخاب کیا گیا جن پر ہمیں آج کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ بین المذاہب وبین المسالک ہم آہنگی کی چیئر (chair) پشاور یونیورسٹی میں قائم ہوگئی ہے۔ اس کی ضرورت کیوں ہے، اس لیے کہ ہم عالمی شہری ہیں۔ پہلے آپ ایک اپنے گاؤں میں، اپنے شہر میں، اپنے ملک میں رہ رہے تھے۔ تو آپ کا واسطہ کسی اور سے نہیں پڑتا تھا، ہر طرف جدھر دیکھو ادھر تو ہی تو ہے، یعنی ہر طرف اپنے جیسے لوگ تھے۔ لیکن اب جدید ٹیکنالوجی سے مزین عالمی معیشت کے اندر جب ہم جاتے ہیں تو وہاں کسی شہر کی، اور صوبے کی یا ملک کی سرحد نہیں ہوتی، وہاں سب لوگ عالمی شہری ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ آپ کے سامنے کون کیسا بیٹھا ہو۔ کچھ پتہ نہیں آپ کے سامنے کوئی عورت امریکہ سے ہے یا چائنہ سے ہے، یا کوئی ہوائی سے بیٹھا ہو یا افریقہ سے بیٹھا ہو، اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہوسکتا ہے۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس گلوبل اکانومی میں ہمیں اپنے بارے میں، اپنے وجود کے بارے میں، دوسروں کے بارے میں بھی معلومات ہونی چاہئیں۔ اور دوسرے مذاہب سے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر اس دنیا کو بہتر جگہ بنانے کے لیے اپنے ملک کو امن کا گہوارہ بنانے کے لئے ہمارے پاس صلاحیت اور پلیٹ فارم بھی ہونا چاہیے۔

سب سے پہلے تو اپنے ملک کو دیکھ لیجئے کہ ہم نے اس کا کیا حال کیا ہے۔ پہلے مذاہب کے جھگڑے ہوتے تھے اب مذاہب کے اندر فِرق درفِرق ہوگئے۔ ہم تقسیم در تقسیم کی جس دلدل میں مبتلا ہوگئے ہیں اس نے ہمیں منتشر کردیا۔ ایک جنگل کا ہجوم بنادیا ہے۔ اسے ہم نے اکٹھا یکجا کرنا ہے چنانچہ کسی قوم کی ترقی کے لئے امن اور داخلی استحکام اور بھائی چارہ ضروری ہوتا ہے۔ ریاستِ مدینہ میں جب میثاق مدینہ ہوا جو شاید دور جدید کا پہلا آئین تھا، اس میں یہ بات تحریر کی گئی، یہ بات تسلیم کی گئی کہ ہروہ شخص جو مدینہ کا شہری ہے، چاہے وہ مسلمان ہے، چاہے وہ یہودی ہے، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہے، وہ ایک قوم ہے۔ ایک امت صرف مسلمانوں کی نہیں تھی۔ اس کے اندر ہر وہ شخص تھا جو اس ریاست کے آئین کا پیروکار تھا۔ لہٰذا اس میں کوئی امتیاز نہیں تھا اور یہ کہا گیا کہ ہروہ شخص جو اس کے اندر شامل ہے اس کی جائیداد، اس کی جان کی حرمت ویسی ہی ہے جیسے کسی مسلمان کی ہے۔ یہ ایک قومی ریاست کا تصور تھا، جس میں مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے لوگ ایک وجود بن کر رہ سکتے ہیں۔ اسے میثاق مدینہ کی صورت میں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ آج ہم اس کے مقابلے میں کہاں کھڑے ہیں۔

میں آپ کو دکھ سے کہتا ہوں کہ آج ہماری فطری پستی کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ میں اپنے حلقے میں مسیحی آبادی کے ساتھ یکجہتی کے لئے ان کے کرسمس کی تقاریب میں شریک ہوا اور میں نے اس کو فیس بک پر تشہیر کیا تو مجھے کئی لوگوں سے بڑا مقابلہ کرنا پڑا۔ انہوں نے کہا آپ کافر ہوگئے ہیں گرجے میں جاتے ہیں۔ میں نے کہا وہ میں کیسے ہوگیا۔ کیاحضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی نہیں ہیں؟ ان کے یوم پیدائش پر مجھے بھی ایسی خوشی ہے جیسے عیسائیوں کو خوشی ہے۔اور اگر میں کسی دوسرے مذہب کی تقریب میں ان سے یکجہتی کے لئے جاتا ہوں تو یہ مطلب تو نہیں کہ میں نے ان کا کلمہ پڑھ لیا ہے،یہ تو ایک آپس کے بھائی چارے کی روح ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں اپنا عقیدہ چھوڑو نا اور دوسرے کا چھیڑو نا۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھنے پر بھی ہم نے کفر کی لائنیں لگادیں ہیں۔ پستی کا یہ عالم ہوگیا ہے۔حالانکہ ہم میثاق مدینہ میں یہ کہہ رہے تھے کہ تمام مذاہب کے جولوگ ہیں وہ ایک قوم ہے،ایک وجود ہے،ایک جسم ہے۔تو اس لئے بے حد ضروری ہے کہ ان چیزوں کو اجاگر کریں اور ان غلط تصورات کو صاف کریں جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں اور جن سے ہم تقسیم در تقسیم اور نفرتوں میں مبتلاگئے۔اسلام نفرت کا مذہب نہیں ہے،یہ تو محبت کا مذہب ہے اس لیے بین المذاہب ہم آہنگی آج کے دور کے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر ہم نے پاکستان کو ترقی دینی ہے تو ہمیں ایک ایسا وجود بننا ہے کہ جس میں کوئی ایک سوئی بھی نہ گزار سکے۔چاہے کسی نام،نسل کے لوگ ہوں اس حوالے سے آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ خیر سگالی سے رہنا ہے۔

اس لئے میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اگر ہم بین المذاہب ہم آہنگی کی ورکشاپ کررہے ہیں اور آج یہاں مسلمان اسکالرز موجود ہیں تو ہمیں دیگر مذاہب کے علماءکرام اور قائدین کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ بین المذاہب ہم آہنگی توتب ہوگی جب دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مکالمے میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گے۔ اگر یہ دو دن کی کانفرنس ہے تو میں امید رکھتاہوں کہ کل آپ دیگر مذاہب کے افراد کو بھی شامل کرلیں گے تاکہ آپس میں ہم بیٹھ کر یہ دیکھ سکیں کہ جو قرآن کی تعلیم ہے کہ آپس میں مکالمہ اس چیز سے کرو جو تمہارے درمیان متفق ہے،بہت ساری چیزوں پر اتفاق ہے،لیکن ہم فرد سے شروع کرتے ہیں۔ جب آپ فرد سے شروع کرتے ہیں تو پھر تقسیم ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا آپ مشترکیات سے شروع کریں کہ اگر ہم اہل کتاب ہیں ہم ایک خدا،وہ تو مشترک ہی ہے اور ہم کچھ ضابطہ اخلاق پر یقین رکھتے ہیں۔ اخلاقیات پر یقین رکھتے ہیں۔ کس قسم کا ہم کردار دیکھنا چاہیے ہیں تو جو مشترکیات ہیں ان کو اپنے سامنے رکھیں اور اسی پر ارتکاز کریں تو آپس میں بھائی چارہ ہوگا۔

یہ ایک بہت اہم سنٹر ہے جس میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو سامنے رکھ کر جاننا چاہتے ہیں کہ مدینہ کے اندر جب ریاست بنی تو آپؐ نے دوسرے مذاہب کے ساتھ بھائی چارے کا جو نمونہ پیش کیا تو کس طرح آپؐ ان سے برتاؤ کرتے تھے اس حوالے سے کس طرح کی آپؐ کی تعلیمات ہیں تو ہم بھی اسی روح کو کیسے آج اپنے معاشرے میں نافذ کرسکتے ہیں۔ اور دنیا کو یہ بتاسکیں کہ اسلام ایک امن کا مذہب ہے۔اور یہ دوسرے مذاہب،دیگر جو نظریات ہیں،ان کے ساتھ کیسے بیک وقت رہ سکتا ہے۔اس سے بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوسکیں گی۔

اسی طرح ایک چیئر (chair) علم و تعلیم پر کام کرے گی۔ دین اسلام وہ مذہب ہے کہ جس کی بنیاد اقراء پر رکھی گئی۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم کا معجزہ دیا گیا آپؐ کو بھی اللہ پاک کہہ سکتے تھے کہ کسی مردہ کو زندہ کردو یا آپؐ اشارہ فرماتے کہ ایک آسمان سے ستارہ زمین پر آگرے، کوئی عمارت بن جاتی، کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں علم کا معجزہ دیا، جو اس بات کی علامت تھا کہ آپؐ کے عہد علم میں انسانیت داخل ہوگئی ہے۔ جب تک ہم نے اس علم کی بنیاد کو تھامے رکھا تو ہم دنیا میں سرفراز تھے، ہم نے علم کے اس ماڈل کو ہی بھلا دیا جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں نافذ کیا تھا۔ دنیا میں اگر آج آپ علم کے حوالے سے معاشروں کا اشاریہ بنائیں تو تعلیم کے حوالے سے مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ یہ حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم والوں کو ناگوار نہیں گزرتا جو لاٹھیاں لے کر سڑکوں پر نکل جاتے ہیں۔ بھائی اگر حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو اس میں تحریک چلاؤ کہ مسلمانوں سے جہالت ختم کریں یہ حبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا ہے۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ دوسرے لوگ سائنس میں جب نوبیل پرائز حاصل کررہے تھے تو تم لوگوں نے کیوں نہیں لیا ؟ تمہاری عقل پر کیوں تالے پڑگئے تھے ؟ قرآن مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کہا کہ یہ کائنات کے مظاہر دیکھو، ان کا مشاہدہ کرو اور ان پر غور وفکر کرو کیوں کہ اس میں بصارت والوں کے لئے اور عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہ چاند ستارے، سورج، سمندر ان سب پر تحقیق کرو۔ سورج، چاند، ستارے تمہارے لئے مسخر کردیے۔ کیوں ناسا کا جہاز اڑ کر چاند پر اور مریخ پر چلا جاتا ہے؟ لیکن کسی مسلمان ملک کو یہ توفیق نہیں کہ وہ بھی تسخیر کائنات کرے۔ یہ تو ہمیں کہا گیا تھا۔ یہ علم کی پستی کیا توہین رسالت کے زمرے میں نہیں آتی؟ کیا بحیثیت قوم ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے روگردانی نہیں کررہے کہ سب سے زیادہ ہمارے بچے سکولوں سے باہر ہیں۔ دنیا کا کوئی بڑا جریدہ اٹھالیں اس میں کسی مسلمان محقق کا مقالہ نہیں ملتا۔ اصلی تحقیق کرنے سے ہماری جان جاتی ہے۔ یہ چیزیں میں سمجھتا ہوں کہ بہت ضروری ہیں بہت سوچنے کی ہیں۔ ہمارے ہاں علم و تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ ہم کس طرح تعلیم اور علم کے اندر دنیا کی نمبرون قوم بن جائیں۔ کیوں نہیں آج وہ ابن الہیثم پیدا ہوتا؟ کیوں نہیں آج ابن سینا پیدا ہوتا؟ کیوں نہیں آج خوارزمی پیدا ہوتا؟ جب تک مسلمانوں میں علم طبعیات، علم الکیمیا، علم بصریات، علم ادویات اور روبوٹس کے موجد پیدا ہوتے تھے ہم دنیا میں بالادست تھے۔ لیکن یہ آپ کبھی نہیں سنیں گے کہ کسی مسجد کے خطبے میں کوئی ہمارے عالم صاحب یہ بتائیں کہ جو مسلمان جاہل ہے اس کا ایمان ادھورا ہے، نامکمل ہے۔ اگر آپ ناخواندہ ہیں تو آپ کا ایمان مکمل نہیں ہے، کیونکہ جو مسلمان قرآن ہی نہیں پڑھ سکتا اس کا ایمان کیسے مکمل ہوگا۔ جو ہماری بنیادی کتاب ہے تو ہمارے ایمان کی تکمیل میں خواندگی ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ لہٰذا تعلیم و علم ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔

نائن الیون کے بعد دنیا میں تحقیق ہوئی اور امریکہ میں ایک ڈاکومینٹری بنی کہ یہ اسلام کیسے پھیلا؟ آگ کی طرح پھیل گیا، یہ دو گھنٹے کی ڈاکومینٹری تھی جو اس وقت نشر ہوئی اور بہت مشہور ہوئی۔ اس کا نچوڑ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات کی صورت میں جس سماجی عدل کا وژن دیا تھا پوری دنیا کے پاس اس وقت اس کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ لہذا یہ پیغام آگ کی طرح پھیل گیا۔ چونکہ انسانیت کو اتنا اچھا سماجی انصاف پر مبنی نظام کی دور دور تک کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ دین اسلام کے پھیلنے میں ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم نے سماجی انصاف کا جو تصور پیش کیا وہ بے نظیر تھا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ آج وہ سماجی انصاف ہمارے پاس کہاں ہے ؟ ہمارے ملک کے اندر ہمارے معاشروں کے اندر ہم کس انداز میں غریب نادار کا ہاتھ تھامتے ہیں، کس طرح ان کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ سماجی ناہمواری کو کس طرح دور کرتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی ان چیزوں پر غور کیا ہے کہ یہ بھی اسلام کی

تعلیمات ہیں۔ جب کہ مغربی ممالک میں سماجی بہبود کے ان تمام تصورات پر، جن کو دور خلفائے راشدین میں جاری کیا گیا، آج عمل ہورہا ہے۔ سماجی بہبود کی وہ تمام اسکیمیں، جو خلفائے راشدین نے جاری کیں، وہ مغربی ممالک میں آپ کو نظر آتی ہیں لیکن ہم نے وہ میراث چھوڑ دی تو اس لئے ہمیں چاہیے کہ سماجی بہبود اور انصاف کو دوبارہ زندہ کریں اور آج کے دور کے تقاضوں سے اس کو دوبارہ ہم آہنگ کریں اور نافذ کریں۔

تیسری چیئر (chair) انسانی حقوق اور سماجی انصاف کی ہے۔ جو منشور ہمیں اسلام نے پیش کیا۔ جو آخری خطبے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انسانی حقوق کا کردار پیش کیا، پوری دنیا میں جو قانون کی درسگاہیں ہیں، ان میں سمجھا جاتا ہے کہ بہترین انسانی حقوق کا منشور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں پیش کیا۔ لیکن آج ہمارے ممالک اور معاشروں میں انسانی حقوق کی کیا قدر ومنزلت ہے اور کس حد تک ان کی پامالی ہورہی ہے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ ہم کس طرح دوبارہ سیرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے انسانی حقوق کے حوالے سے، جو ان کی تعلیمات ہیں، ان کا احاطہ کرسکتے ہیں۔

ایک چیئر (chair) لیڈرشپ اور طرزِ حکمرانی پر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے لیڈرشپ کے نمونہ کو سیکھیں کہ کیسے انہوں نے نامساعد حالات کے اندر، دشمنوں کے ہوتے ہوئے کس حکمت عملی کو اختیار کیا، کس طرح اپنی ٹیم کو تیار کیا، کس طرح اپنی کامیابی کو اداراتی صورت دی۔ ان کے کیا حکمت بھرے اقدامات تھے جس سے کامیاب لیڈرشپ کے نمونے کا تصور سامنے آتا ہے۔ ہم ایک عقیدت کے طور پر سیرت پر تو سر دھنتے ہیں، وہ ہم سب کا ایمان ہے کہ ہمیں احترام کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم نے کبھی بھی اس سیرت کو لیڈر شپ کے اسباق میں ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کا ایک واقعہ پڑھا، کہ ایک صحابی تھے جو غالباً نابینا تھے اور جسمانی طور پر بہت کمزور سے تھے۔ حضرت عمرؓ کو یہ دل میں خیال آیا کہ ان کی دیکھ بھال کے لئے میں کوئی بندوبست کروں تو وہ جب بھی ان کے گھر کی صفائی کرنے یا خدمت کے لئے جاتے تھے تو پتہ لگتا تھا کہ پہلے سے کوئی کرگیا ہے۔ انہوں نے اپنا وقت تبدیل کرنا شروع کیا کہ میں گھنٹہ پہلے آؤں، دوگھنٹے پہلے آؤں، تین گھنٹہ پہلے آؤں، اتنا پہلے آؤں کہ پتہ تو چلے کہ کون ہے ؟ ایک دن جب انہوں نے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ، صبح صبح آتے اور وہ سارا جھاڑ پونچھ کر کے ان کے گھر کو صاف کرکے چلے جاتے۔ اب میں سوچ میں تھا کہ دیکھئے وہ سب سے زیادہ پرآشوب دور ہے کہ جہاں فتنے کھڑے ہورہے ہیں اور جو خلیفہ ہے ان کو کتنے محاذوں پہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور انہوں نے اس حد تک گنجائش پیدا کی ہے کہ جہاں وہ اپنا ایک انفرادی عمل بھی کررہے ہیں جو اپنے لیے وہ ایک خدمت سمجھتے تھے، تو ان کی جو نجی مصروفیات تھیں اس میں بھی اور عوامی مصروفیات میں بھی لوگوں کی خدمت کے لیے وقت نکالتے تھے۔ کیسے وہ اتنا وقت نکالتے تھے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اور اس دور میں ان کی عوامی خدمات میں بھی کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ ان کی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے ایک بہترین تقسیم نکالی کہ غالباً دس یا بارہ انہوں نے گورنر تعینات کردیئے اور بہترین لوگوں کو آگے تعینات کردیا۔ تو ایک ٹیم اور لیڈرشپ کے حوالے سے اختیارات کی تقسیم کا ماڈل سامنے آیا کہ جب آپ اپنے کام کو تقسیم کریں اور اچھی ٹیم منتخب کریں تو یقیناً لیڈر کے پاس گنجائش نکل آتی ہے کہ وہ کچھ وقت اپنی ترجیحات کے لئے مقرر کرسکتا ہے۔ لیکن کیا ہم نے کبھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کو اس حوالے سے بھی پڑھا ہے کہ ان کی لیڈرشپ کے کیا اصول تھے جن کے مطابق وہ کامیاب ہوئے، کبھی کسی نے کسی کتاب میں یہ واقعات ہوتے دیکھے؟ لیکن ایک عقیدت کی کہانی کے طور پر ضرور ہم سب واقعات پڑھتے ہیں تو جو لیڈرشپ کے اصول جنہوں نے ہمیں کامیابی دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے وہ کیا اصول ہیں، جو ہم اپنی زندگی میں لاسکتے ہیں، اس کے اوپر تحقیق ہوتا کہ ایک لیڈرشپ کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش آئے۔

ایک چیئر (chair) پائیدار ترقی کے حوالے سے ہے۔ سب سے بڑی ماہر ماحولیات شخصیت دنیا میں آپ کہہ سکتے ہیں تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ جنہوں نے ایک بیج لگانے کی بات کی۔ یہاں تک میں نے پڑھا تھا کہ اگر قیامت بھی آجائے اور تمہارے ہاتھ میں بیج ہو تو وہ بھی اس وقت ہریالی کے لیے اور شجرکاری کے لئے لگادو، اور ہدایت کی کہ اگر دریا کے اوپر بیٹھ کر بھی وضو کررہے ہو تو اس وقت بھی پانی کو بچاؤ، ایک قطرہ بھی ضائع نہ کرو، شجرکاری کے حوالے سے جنگ کے اندر ہدایات دیں کہ کسی درخت کو خراب نہیں کرنا۔ ہم نے ان تعلیمات کو آج کے لئے اپنے اسلام آباد شہر کے اندر اپنے سامنے مدنظر رکھا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں اس بات کا کچھ احساس نہیں ہے۔ پائیدار ترقی آج سب سے بڑا مسئلہ کیوں بن گیا ہے کہ ہم اس دنیا کے وسائل کو بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ اور یہ سوچے بغیر کہ آنے والی نسلوں کا ان وسائل کے اوپر بھی حق ہے تو اگر آج پائیدار ترقی کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو تعلیمات ہیں، ان پر ہم عمل کریں تو ہم ایک ذمہ دار شہری بن سکتے ہیں اور ماحولیات کے حوالے سے جو تعلیمات ہیں ان کی آج کی زندگی سے کیا واسطہ ہے، ان کو مرتب کیا جائے۔

ایک چیئر (chair) کاروباری تجارت اور حقوق جائیداد پر ہے۔ میں جب امریکہ میں تھا تو بڑا پریشان ہوتا تھا کہ جس دکان پر جاؤں کتاب یا چیز واپس کروں تو خوشی سے رقم کی واپسی ہو جاتی ہے اور رسید بھی نہیں مانگتے۔ چاہے خریداری میں ایک مہینہ گزر جائے۔ آپ میں سے جو حضرات بیرون ملک رہے ہیں ان کو پتہ ہوگا کہ چیزیں واپس کرتے ہوئے کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور ہمارے ہاں آئیں تو اپنی دکان کے نام سے بڑا نوٹس یہ لکھا ہوتا ہے کہ فروخت کیا ہوا مال واپس نہیں کیا جائے گا۔ میں بڑا پریشان تھا کہ اس سے تو ان کو خسارہ پڑتا ہوگا۔ میں نے ایک حدیث پڑھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ دکاندار جو خوشی سے فروخت کیا ہوا مال واپس لیتا ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اسے ایک ایسا محل دیں گے جو ایسی موتی سے بنا ہوگا جس کا کوئی جوڑ نہیں ہوگا۔ ایک صحابی جو تجارت کرتے تھے انہوں نے اپنی تجارت بند کی اور دکان کھول لی کہ میں نے یہ اجر لینا ہے کافی دنوں کے بعد ایک گاہک آیا کہ حضرت میں نے یہ آپ سے سودا لیا تھا یہ واپس کرنا ہے، کہا اچھا لاؤ، ٹھیک ہے، چادر بچھاؤ، کھانا لاؤ، پیسے تمہارے یہ ہیں لیکن میں تو اس سے تمہاری خدمت کر رہا ہوں کہ میں نے تمہارا اجر لینے کے لئے یہ دکان کھولی تھی۔ دیکھیں یہ کردار تھے کہ جنہوں نے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔ **اسی طرح اسلام آباد میں ایک صاحب تھے ان سے کسی مجمع میں یہ حدیث پوچھی تو انہوں نے کہا آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے میرے بیٹے بڑے سخت تھے، اس کی سپر مارکیٹ میں شوز کی دکان تھی تو میں نے کہا جھگڑا نہ کیا کرو اگر کوئی شخص مال واپس کرتا ہے تو لے لیا کرو۔ کہتا ہے جب سے ہم نے رقم کی واپسی کی آزاد پالیسی بنائی پتہ نہیں پچاس گنا سے ستر گنا فروخت بڑھ گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ اب خواتین آتی ہیں تو جو جوتیاں پسند آتی ہیں یا نہیں آتیں وہ ایک خیال سے لے جاتی ہیں کہ میں آپ کو گھر سے پسند کر کے ایک واپس کر جاؤں گی۔ وہ جب گھر دونوں لے جاتی ہیں تو پھر واپس نہیں کرتیں تو انہوں نے کہا کہ یہ رقم کی واپسی کی انشورنس ہے اس نے ہماری فروخت زیادہ کر دی ہے۔ یہ کامیاب کاروبار کا راستہ ہے۔ لیکن ہم بخیل کتنے ہیں جی کہ فروخت کیا ہوا مال واپس نہیں ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کاروباری طریقے تجارت میں اختیار کیے، جو ہمیں سمجھائے، کیا ہم نے ان کو اختیار کیا ہے کہ خوش اخلاقی سے اپنے گاہک کو ملو کیونکہ مسلمان کا مسکرانا بھی صدقہ ہے۔**

بیرونی ممالک میں گاہکوں کو بہترین سہولیات فراہم کرنے پر بھاری رقوم خرچ کی جاتی ہیں کہ کمپنی کے ملازمین کیسے خوش اخلاقی سے اپنے گاہکوں سے پیش آئیں جس سے ان کی کمپنی کا برانڈ مقبول ہو۔ اگر آپ دیکھیں تو بہترین معیار کو برقرار رکھنے کے سارے اصول ہمارے پاس موجود ہیں۔ میں نے ایک استاد کو جب کہا کہ بہترین معیار کو برقرار رکھنے کے تصور کو جاپانیوں نے بڑا اچھا استعمال کیا۔ آپ بھی کیا کریں تو انہوں نے کہا کہ اہل جاپان کر سکتے ہیں مگر ہم نہیں تو میں نے کہا کہ ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن وہ ہے کہ جس کا آنے والا دن اس کے گزشتہ دن سے بہتر ہو۔"

افتتاحی تقریب کے بعد اجلاس کے شرکاء کو تین گروپس میں تقسیم کیا گیا اور بین المذاہب اور سماجی ہم آہنگی کے مسائل پر تین مختلف بنیادوں سماجی-ثقافتی، سماجی-معاشی اور سماجی-سیاسی (Socio Cultural, Socio Economical, Socio Political) پر غوروخوض اور مشاورت کی گئی۔ مختلف النوع مسائل پر ان تین گروپس کے مشاورتی نکات کو جمع کیا گیا اور ورکشاپ کی اختتامی اور مشترکہ نشست میں پاکستان میں مذہبی و سماجی ہم آہنگی کو درپیش مسائل اور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں ان کا حل نیز قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس حوالے سے اشتراک عمل کے امکانات پر تحقیق کے لیے موضوعات اور ان کے فروغ کے لیے حکمت عملی پر تجاویز اور سفارشات مرتب کر کے ایچ ای سی کے سیرت چیئرز کے عہدیداروں اور اجلاس کے منتظمین کے حوالے کر دی گئیں۔

تقریب کے اختتام میں سینٹ آف پاکستان کے رکن جناب سینیٹر عثمان کاکڑ نے خطاب کیا اور قومی اور عالمی حالات کے تناظر میں مذہبی ہم آہنگی کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی۔

ورکشاپ کے شرکاء نے غوروخوض اور مشاورت کے بعد درج ذیل موضوعات برائے تحقیق تجویز کیے۔

تجویز کردہ موضوعات برائے تحقیق

۱. نصاب سازی میں مصروف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ وشمولیت
۲. معاشی، سیاسی اور تہذیبی معاملات میں خواتین کا کردار اور ان کی ذمہ داریاں، معروف مذاہب میں موجود تعلیمات کی روشنی میں
۳. اسلام میں رسم ورواج اور دیگر مذاہب کی ثقافتی اقدار، مختلف علاقہ جات ومذاہب کے تناظر میں
۴. ہجرت حبشہ کے دوران قیام پذیر مسلمانوں کی کامیاب زندگی کا پس منظر (سماجی، معاشی، اور معاشرتی حوالے سے جائزہ) عصر حاضر میں مسلم اقلیتوں کے لیے ماڈل
۵. غیر مسلم اقلیت کے ساتھ تعامل، رویے اور مسائل (پاکستانی معاشرت کے تناظر میں)
۶. مکی عہد میں مسلمانوں کی معاشی، سماجی اور مذہبی مشکلات اور رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی
۷. پاکستان میں غیر مسلموں کے لیے موجود قوانین کا تجزیاتی مطالعہ
۸. ریاست مدینہ میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانون کا انفرادی واجتماعیت تعامل؛ عصر حاضر میں تطبیق
۹. غیر مسلموں کی مذہبی وسماجی تقریبات میں شرکت، حدودوآداب
۱۰. بین المذاہب سماجی ہم آہنگی کے لیے " وثائق سیاسیہ " کا کردار

۱۱. مکی عہد نبویؐ میں مسلم و غیر مسلم سماجی تعلقات
۱۲. حبشہ میں مسلم مسیحیت تعامل
۱۳. سیرت نبویﷺمیں متعلقہ فریقوں کو نظمِ اجتماعی میں لانے کے لیے مشاورت کا حصہ بنانا
یعنی :سیرت نبویؐ میں اجتماعی مشاورت اوراس کے اثرات
۱۴. سیرت نبویؐ میں رائے عامہ کی رعایت اور سماجی ارتباط میں اس کی اہمیت
۱۵. رسول اللہﷺ کی شخصیت کے سماجی پہلو کا تعارف
۱۶. سیرت نبویؐ میں دیگر مذاہب کے جذبات واحساسات کی رعایت
۱۷. دینی واجتماعی اہداف کے حصول میں غیر مسلموں کا تعاون واستفادہ
۱۸. معاشرتی تنازعات کے حل کی نبویؐ حکمت عملی
۱۹. سماجی تقسیمات کے لیے نبوی مناہجِ اصلاح
۲۰. قبائلی معاشرت کی قومی تشکیل کی نبویؐ حکمت عملی
۲۱. محروم معاشرتی طبقات کی معیار زندگی بہتر بنانے کا نبویؐ اسلوب اور سماجی ہم آہنگی میں اس کا کردار
۲۲. مذہبی مخاصمت سے نبرد آزما ہونے کی نبویؐ حکمت عملی
۲۳. عہد صحابہ میں غیر مسلموں سے سماجی روابط
۲۴. عہد نبویؐ وعہد صحابہ کی معاشی سرگرمیوں میں دیگر مذاہب سے تعامل
۲۵. فقہ السیرہ کی بطور ڈسپلن تشکیل
۲۶. تکریم انسانیت سیرت النبیﷺ کی روشنی میں
۲۷. دین اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق وفرائض
۲۸. اقلیتوں کے ساتھ سماجی روابط سیرت طیبہؐ کی روشنی میں
۲۹. غیر مسلموں کی مذہبی آزادی سیرۃ رسولؐ کی روشنی میں
۳۰. دین اسلام کے معاشی مساوات کے اصول اور سماجی ہم آہنگی میں اس کا کردار
۳۱. اصول سیاست میثاق مدینہ کی روشنی میں
۳۲. اصول دفاع سیرت الرسولؐ کی روشنی میں
۳۳. ریاست اور رعایا کے درمیان تعلقات کے اصول خطبہ حجۃ الوداع کی روشنی میں، سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے
۳۴. عہد رسالت میں مسلم اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت: مکالمہ بین المذاہب اور سماجی ہم آہنگی میں ان کا کردار
۳۵. عہد خلفاء راشدین میں مسلم اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات: مکالمہ بین المذاہب اور سماجی ہم آہنگی میں ان کا کردار
۳۶. غیر مسلموں کے بارے میں ان کے تحفظات جاننے کے لیے سروے کرنا / کروانا
۳۷. رسول اللہﷺ ماضی قریب اور عصر حاضر کے مفکرین اور دانشوروں کی نظر میں (بطور مثال کیرن آرم سٹرانگ وغیرہ)
۳۸. غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے لیے مکی دور بطور طرز حیات (ہجرت حبشہ بطور منہج)
۳۹. غیر مسلموں کے تعلقات رواداری پر مبنی فقہی احکامات کی تدوین
۴۰. مکالمہ بین المذاہب پر کی گئی تحقیقی کتب-جرائد اور تحقیقی مقالے (جمع وتدوین)
۴۱. مکالمہ بین المذاہب سے متعلق کتب کا انگریزی / عربی سے اردو میں ترجمہ کرنا اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کروانا۔
۴۲. حالت جنگ میں غیر محاربین کے حقوق کا تحفظ

۴۳. دیگر مذاہب گاہوں کا تحفظ
۴۴. تصور رحمۃ للعالمین کا احیاء
۴۵. بین الاقوامی تعلقات: سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں
۴۶. Case Studies کروانا تا کہ معلوم ہو جائے کہ مذہبی عدم رواداری میں اصل اسباب کو سامنے لایا جائے۔
۴۷. (بطور مثال رمشاء مسیح کیس۔یوحنا آزاد)
۴۸. غیر مسلم ممالک / غیر مسلموں میں حصول تعلیم: سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
۴۹. اردو زبان میں تقابل ادیان کے ادب کا تنقیدی مطالعہ
۵۰. غیر مسلموں کے مذہبی تہوار ور سوم فقہ السیرہ کی روشنی میں
۵۱. حبشہ کے معاشرے میں مسلمان بحیثیت اقلیت
۵۲. تعلیمی نصاب میں موجود تعصبانہ مواد کا تحقیقی جائزہ
۵۳. سیرت النبی ﷺ کا سماجی / معاشرتی مطالعہ
۵۴. ریاست مدینہ بطور نیشنل اسٹیٹ۔ایک مطالعہ (مسلم اور غیر مسلم شہریوں کی اجتماعیت کا خصوصی مطالعہ)
۵۵. رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ِقومی وملی
۵۶. سیرت کی روشنی میں جنگی تعلیمات واخلاقیات کا مطالعہ
۵۷. قیدیوں کے حقوق کا سیرت کی روشنی میں جائزہ
۵۸. غیر مسلم اقلیتوں کی مذہبی آزادی، سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
۵۹. رائے عامہ کی اہمیت سیرت کی روشنی میں
۶۰. حکمرانوں کے خلاف خروج کے حوالے سے تعلیمات نبویؐ کا جائزہ
۶۱. جہاد کے احکامات اور تعلیماتِ نبویؐ کا مطالعہ (قتال ریاست کی ذمہ داری ہے، ایک جائزہ لینا)
۶۲. غیر مسلموں کی خامیاں اور بُری صفات بتانے والی آیات واحادیث کا جائزہ (معلوم کرنا کہ وقتی طور پر یہ کیفیت بیان کی گئی کہ غیر مسلم ہمارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے)۔
۶۳. رسول اللہ ﷺ کا غیر مسلموں کی سماجی فلاح وبہبود کے اقدامات کا جائزہ
۶۴. حکمرانوں کے حقوق وفرائض اور ذمہ داریوں کا جائزہ سیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں
۶۵. سیرت نبویہؐ میں معاہد کے قوانین کا جدید مغربی ممالک میں اقلیتوں کے قوانین سے تقابلی مطالعہ
۶۶. اکثریت کا اقلیت سے تعامل۔ بین الاقوامی مطالعہ
۶۷. معاشرتی مسائل میں رہنمائی کے لیے سیرت نبویہؐ کا اختصاصی مطالعہ
۶۸. معاہدات نبویہؐ کی روشنی میں بین المذاہب ہم آہنگی ومخاصمت کے رہنما اصول وضوابط (یہود۔ نصاریٰ۔ مشرکین)
۶۹. دیگر مذاہب کے ساتھ سماجی تعلقات / سماجی رویے (تعامل نبویؐ) (تعامل صحابہ)
۷۰. مذاہب عالم کے مشترکات مذہبی (عبادات) سماجی (رسومات / تہوار)
۷۱. مذاہب عالم کے مقدسات کی تحریم ورعایت (شخصیات / مقامات / کتب / تہوار ورسومات)
۷۲. غیر مسلموں کا مطالعہ سیرت (نثر ونعت) بین المذاہب ہم آہنگی اور مخاصمت کے تناظر میں
۷۳. اہل الذمہ کے لیے سیرتِ طیبہؐ اور خلفائے راشدین کا مطالعہ
۷۴. "وھم صاغرون" کی تفسیر کا تحقیقی مطالعہ (سیرت طیبہ کی روشنی میں، تعامل نبوی وتعامل صحابہ)

۷۵. مسلمانوں کی اصطلاحاتِ دار (دارالحرب، دارالاسلام، دارالعہد، دارالدعوہ) سماجی مطالعہ کی روشنی میں

۷۶. "مواساۃ" کی اصطلاح (نبوی ماڈل کا مطالعہ اور عہد حاضر میں اس معنویت)

۷۷. اسلامی ریاست میں بین المذاہب ہم آہنگی کی مثالیں (انتظامی، دفاع، عدالت وقضاء، مالیات)

۷۸. بین الاقوامی ماہرین (صحافی، سفارت کار، معیشت دان، پالیسی سازوغیرہ) کے سماجی رویے اور تعلقات (سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)

۷۹. پاکستان میں اقلیات کے حقوق وفرائض؛ میثاق مدینہ کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

۸۰. عدل اجتماعی کے فروغ میں ممکنہ عملی صورتیں، سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں مطالعہ

۸۱. بچوں کے حقوق کا عالمی معاہدہ (CRC) سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں تجزیاتی وتحقیقی مطالعہ

۸۲. خواتین کے حقوق کا عالمی معاہدہ (CEDAW) فقہ السیرہ کی روشنی میں تقابلی مطالعہ

۸۳. غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

۸۴. اقلیات کے ساتھ تعلقات سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

۸۵. حل تنازعات کے اسالیب سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

۸۶. بین المذاہب چیلنجز پاکستان میں اور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں ان کا حل

۸۷. پاکستان میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی مسائل کی نشان دہی اور سیرت طیبہؐ کی روشنی میں ان کا حل

۸۸. پاکستانی شناخت کا بحران: تشریح وتشکیل نو کا تجزیاتی مطالعہ

۸۹. تکریم انسانیت سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

۹۰. دین اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق وفرائض

۹۱. اقلیتوں کے ساتھ سماجی روابط سیرت رسول کی روشنی میں

۹۲. دین اسلام کے معاشی مساوات کے اصول اور سماجی ارتباط میں اس کا کردار

۹۳. اصول سیاست میثاق مدینہ کی روشنی میں

۹۴. اصول دفاع سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
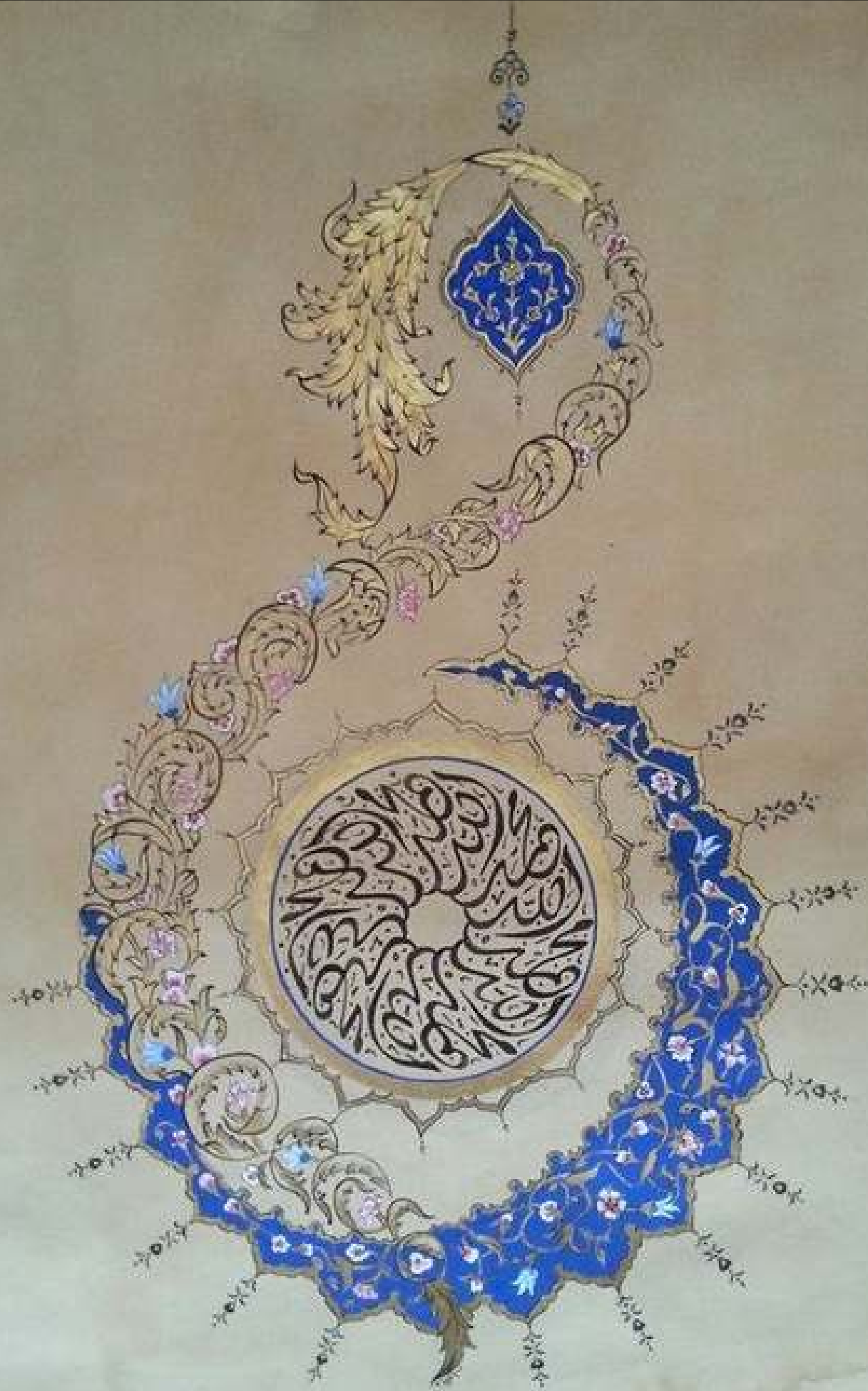
سفارشات وسرگرمیاں

کونسل کا ۲۰۸واں اجلاس

(۶/ دسمبر ۲۰۱۷ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کا ۲۰۸واں اجلاس مؤرخہ ۶/ دسمبر ۲۰۱۷ء بروز بدھ زیر صدارت جناب پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز، چیئرمین کونسل انعقاد پذیر ہوا۔ اجلاس میں درج ذیل معزز اراکین کونسل نے شرکت فرمائی:۔

"جناب علامہ عبدالحکیم اکبری، جناب جسٹس (ریٹائرڈ) محمد رضا خان، جناب ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، محترمہ ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی، جناب صاحبزادہ زاہد محمود قاسمی، جناب مولانا امداد اللہ، جناب عبداللہ، جناب علامہ سید افتخار حسین نقوی، جناب جسٹس (ریٹائرڈ) منظور حسین گیلانی، جناب ڈاکٹر قاری عبدالرشید، جناب عارف حسین واحدی، جناب ابوالظفر غلام محمد سیالوی، جناب مولانا حافظ فضل الرحیم، جناب ملک اللہ بخش کلیار، جناب خورشید احمد ندیم"۔

اجلاس کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں نئے آنے والے معزز ممبران کونسل کو خوش آمدید کہنے کے بعد باہمی تعارف ہوا۔ اس کے بعد ایجنڈا پر باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا اور درج ذیل آئٹم زیر بحث آئے اور فیصلے ہوئے:

- (الف) سارک انرجی سنٹر (SEC) کا زکوٰۃ سے استثنٰی کے لیے سرٹیفکیٹ کا حصول، (ب) زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے سیکشن نمبر ۲ کے تحت مختلف اداروں / سوسائٹیز اور فنڈز کا زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے استثناء اور نفع بخش اسکیموں میں سرمایہ کاری استفسارات از وزارت مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

- پاکستانی کرنسی کے ایک روپیہ کے سکے پر تحریر کردہ نام "قائد اعظم محمد علی جناح" استفسار از وزارت مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی، حکومت پاکستان اسلام آباد
- قومی پالیسی برائے بین المذاہب ہم آہنگی اور قانون برائے قومی کمیشن ۲۰۱۵ء کے مسودات۔۔۔ استفسار از وزارت مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی، حکومت پاکستان اسلام آباد

- پاکستان پینل کوڈ (ترمیمی) بل، ۲۰۱۷ء (دیت کی رقم کا تعین)۔۔۔استفسار از وزارت داخلہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد
- فوجداری قانون (ترمیمی) بل، ۲۰۱۷ء (بابت میت کی توہین وغیرہ)---استفسار از وزارت داخلہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد

- انسداد جادوگری (Witchcraft) بل، ۲۰۱۷ء---استفسار از قائمہ کمیٹی وزارت داخلہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد
- پاکستان پینل کوڈ (ترمیمی) بل، ۲۰۱۷ء (اقدام خودکشی کی سزا)--استفسار از وزارت خارجہ، حکومت پاکستان، اسلام آباد
- ہندو میرج بل ۲۰۱۶ء کی دفعہ ۱۲(۱)(iii)---مراسلہ از انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد
- قانون انتخاب بل ۲۰۱۷ء---برائے اطلاع
- مسلم عائلی قوانین (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۱۷ء (بل) (بابت فقہ جعفریہ میں تقسیم میراث) استفسار از وزارت قانون وانصاف، حکومت پاکستان، اسلام آباد---برائے اطلاع ورائے۔

توسیعی خطبہ "پاکستان میں انتخابی قوانین کی قومی تاریخ اور اس میں ترمیمات کا جائزہ"

مؤرخہ ۲۷ر دسمبر ۲۰۱۷ء بروز بدھ کو اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام ایک توسیعی خطبہ بعنوان "پاکستان میں انتخابی قوانین کی قانونی تاریخ اور ان میں ترمیمات کا جائزہ" کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف جامعات اور دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے اساتذہ اور طلباء نے شرکت کی۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبہ لاء و شریعہ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد نے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے ۱۸۵۸ء لے کر ۲۰۱۷ء تک کے انتخابی قوانین کی قانونی تاریخ، اس تمام عرصہ میں ہونے والے انتخابات کا طائرانہ جائزہ، آئینی ترامیم کے پیش نظر انتخابی نظام پر مرتب ہونے والے اثرات، وقتاً فوقتاً انتخابات کے لیے بننے والے قوانین کا تعارف، لوکل باڈیز اور لوکل گورنمنٹ کے نظام، وفاقی اور پارلیمانی طرز حکومت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد نے انتخابات قانون، ۲۰۱۷ء کا تفصیلی تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ ختم نبوت والے حساس مسئلہ کے علاوہ دیگر متعدد خصوصیات کا حامل ہے اور اس کے ذریعے متعدد دیگر انتخابی قوانین کو یکجا کر کے اسے ایک جامع قانون کی شکل دے دی گئی ہے۔ ختم نبوت کے حلف نامے کے معاملے کو دو ترامیم کے ذریعے بطریق احسن حل کر دیا گیا ہے اور اب اس حوالے سے مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس قانون میں مزید امور پر بحث کی جائے اور دیگر امور کی طرف بھی رہنمائی کی جائے۔ آخر میں ڈاکٹر مشتاق صاحب نے حاضرین کے متعدد علمی و قانونی سوالات کے جوابات دیئے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار کو سراہا۔ نیز اس بات پر زور دیا کہ پارلیمنٹ کو آئینی تقاضے کے مطابق کونسل کی سفارشات کو مجالس قانون میں زیر بحث لانا چاہیے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز نے اپنے اختتامی کلمات میں شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت ہی آج کے دور میں ترقی کے لیے بہترین نظام ہے اور دنیا کے مزاج اور شعور نے اسی کو تاحال قبول کر لیا ہے۔ غیر جمہوری اور غیر آئینی طریقے عوامی مشکلات اور سیاسی عدم استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل قانون سازی کے ساتھ معاشرے کے ساتھ بھی اپنے روابط مضبوط کرنا چاہتی ہے اور پارلیمانی نمائندگان کے ساتھ لابنگ اور تعامل کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

فہرست مطبوعات

اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

سالانہ رپورٹیں

	رپورٹ	سن طباعت
1-	دس سالہ رپورٹ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۳ء	۱۹۹۲ء
2-	سہ سالہ رپورٹ ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۷ء	جولائی ۱۹۸۶ء
3-	سالانہ رپورٹ ۱۹۷۸- ۱۹۷۷ء	فروری ۱۹۷۹ء
4-	سالانہ رپورٹ۱۹۷۹- ۱۹۷۸ء	جنوری ۱۹۸۰ء
5-	سالانہ رپورٹ۱۹۸۱- ۱۹۸۰ء	مئی ۱۹۸۱ء
6-	سالانہ رپورٹ۱۹۸۲- ۱۹۸۱ء	ستمبر ۱۹۸۳ء
7-	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۳- ۱۹۸۲ء	ستمبر ۱۹۸۳ء
8-	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۴- ۱۹۸۳ء	مئی ۱۹۸۴ء
9-	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۷- ۱۹۸۶ء	۱۹۸۸ء
10-	سالانہ رپورٹ ۱۹۸۸- ۱۹۸۷ء	جون ۱۹۸۸ء
11-	سالانہ رپورٹ۱۹۸۹- ۱۹۸۸ء	مئی ۱۹۸۹ء
12-	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۱- ۱۹۹۰ء	مئی ۱۹۹۱ء
13-	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۲- ۱۹۹۱ء	مارچ ۱۹۹۲ء
14-	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۳- ۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء
15-	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۸- ۱۹۹۷ء	جون ۲۰۰۰ء
16-	سالانہ رپورٹ ۱۹۹۹- ۱۹۹۸ء	جون ۲۰۰۰ء
17-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۰- ۱۹۹۹ء	مئی ۲۰۰۰ء
18-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۱- ۲۰۰۰ء	اکتوبر ۲۰۰۲ء
19-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۲- ۲۰۰۱ء	جولائی ۲۰۰۳ء
20-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۳- ۲۰۰۲ء	اگست ۲۰۰۳ء
21-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۴- ۲۰۰۳ء	جولائی ۲۰۰۵ء
22-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۵- ۲۰۰۴ء	فروری ۲۰۰۶ء
23-	سالانہ رپورٹ (سمری) ۲۰۰۵- ۲۰۰۴ء	مارچ ۲۰۰۶ء
24-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۶- ۲۰۰۵ء	مارچ۲۰۰۷ء
25-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۷- ۲۰۰۶ء	اکتوبر۲۰۰۷ء
26-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۸- ۲۰۰۷ء	اگست۲۰۰۸ء
27-	سالانہ رپورٹ ۲۰۰۹- ۲۰۰۷ء	اکتوبر۲۰۰۹ء
28-	سالانہ رپورٹ ۲۰۱۰- ۲۰۰۹ء	۲۰۱۳ء

-29	سالانہ رپورٹ ۲۰۱۱- ۲۰۱۰ء	۲۰۱۳ء
-30	سالانہ رپورٹ ۲۰۱۲- ۲۰۱۱ء	فروری۲۰۱۴ء
-31	سالانہ رپورٹ ۲۰۱۳- ۲۰۱۲ء	اکتوبر۲۰۱۴ء
-32	سالانہ رپورٹ۲۰۱۴- ۲۰۱۳ء	مئی۲۰۱۵ء

قوانین کی اسلامی تشکیل کے بارے میں رپورٹیں

-33	احکام اسلام	مئی ۱۹۸۴ء
-34	اسلامی نظام عدل	فروری ۱۹۸۴ء
-35	اسلامی نظام حکومت	جون ۱۹۸۳ء
-36	رپورٹ آئینی اصلاحات	دسمبر ۱۹۹۱ء
-37	مسودہ اسلامی قانون شہادت ۱۹۸۲ء	اگست ۱۹۸۲ء
-38	رپورٹ بابت قانون شہادت ۱۸۷۲ء	جنوری ۱۹۸۲ء
-39	Islamic Criminal Laws (Part- 1) (Hudood)	اپریل ۱۹۸۲ء
-40	Draft Law of Pre- emption	مئی ۱۹۸۱ء
-41	Draft Law of Qisas and Diyat	جون ۱۹۸۱ء
-42	Islamization in Pakistan	مئی ۱۹۸۴ء
-43	Three Shariah Draft Laws 1988	مئی ۱۹۸۹ء
-44	1st Report on Islamization of Laws (Vol.I)	دسمبر ۱۹۸۱ء
-45	2nd Report on Islamization of laws (Vol.II)	مارچ ۱۹۸۲ء
-46	3rd Report on Islamization of laws (Vol. III)	اپریل ۱۹۸۲ء
-47	4th Report on Islamization of laws (Vol. IV)	اپریل ۱۹۸۲ء
-48	5th Report on Islamization of laws (Vol. V)	جنوری ۱۹۸۳ء
-49	6th Report on Islamization of laws (Vol. VI)	فروری ۱۹۸۳ء
-50	7th Report on Islamization of laws (Vol.VII)	مارچ ۱۹۸۳ء
-51	8th Report on Islamization of laws (Vol.VIII)	جون ۱۹۸۳ء
-52	9th Report on Islamization of laws (Code of Criminal Procedure 1898)	ستمبر ۱۹۸۳ء
-53	10th Report on Islamization of laws (Muslim Family Laws)	اپریل ۱۹۸۳ء
-54	11th Report on Islamization of laws (Insurance and Insurance Laws)	مارچ ۱۹۸۴ء
-55	12th Report on Islamization of laws (Fiscal System and Fiscal Laws)	مارچ ۱۹۸۴ء
-56	13th Report on Islamization of laws (Tax Laws)	اپریل ۱۹۸۴ء
-57	14th Report on Islamization of laws(Transfer of Property Act 1882 Contract Act 1872 Specific Relief Act 1877)	مئی ۱۹۸۴ء

-58 15th Report on Islamization of laws — مئی ۱۹۸۴ء

-59 فائنل رپورٹ (انگریزی) — دسمبر ۱۹۹۶ء

-60 فائنل رپورٹ (اردو) (۱۸۳۹ء تا ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء) — نومبر ۱۹۹۸ء

-61 جائزہ مجموعہ ضابطہ فوجداری،۱۸۹۸ء۔ ملاحظات،مجوزہ ترامیم — مئی ۲۰۰۰ء

-62 قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد اول (قوانین ۱۵؍ اگست ۱۹۷۳ء تا ۴ جولائی ۱۹۷۷ء) — مئی ۲۰۰۰ء

-63 رپورٹ جائزہ مجموعہ ضابطہ دیوانی،۱۹۰۸ء۔ ملاحظات،مجوزہ ترامیم — اگست ۲۰۰۰ء

-64 تطبیق الشریعۃ فی باکستان

-65 مجلس الفکر الاسلامی بالباکستان (تقریر موجز عن اعمالہ) — مارچ ۱۹۸۰ء

-66 مجلس الفکر الاسلامی بالباکستان (تعریف موجز باعمالہ) — ۱۹۹۳ء

-67 توصیات دستوریہ، بخصوص نظام الحکومۃ — ۱۹۸۳ء

-68 قوانین کی اسلامی تشکیل، سلسلہ دوم، جلد چہارم (قوانین مجریہ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء تا ۳۱؍ دسمبر ۲۰۰۲ء) — اکتوبر ۲۰۰۳ء

-69 پاکستان میں رائج قوانین(۱۹۷۶ء- ۲۰۰۶ء) کا جائزہ-کونسل کی ۸۶ رپورٹوں کا خلاصہ — ۲۰۰۸ء

معیشت کی اسلامی تشکیل پر رپورٹیں

-70 مجموعی سفارشات متعلقہ نظام معیشت (۹۳- ۱۹۹۲ء) — دسمبر ۱۹۸۴ء

-71 اسلامی نظام معیشت — ستمبر ۱۹۹۲ء

-72 رپورٹ بلاسود بنکاری — ۱۹۸۰ء

-73 رپورٹ اسلامی نظام بیمہ — جون ۱۹۹۲ء

-74 تقریر مجلس الفکر الاسلامی بشان الغاء الفائدہ من الاقتصاد — ۱۹۸۲ء

-75 Introduction of Zakat in Pakistan — ۱۹۸۱ء

-76 Elimination of Riba from the Economy and Islamic Modes of Financing — جون ۱۹۸۰ء

-77 Islamic Insurance System — جون ۱۹۹۵ء

نظام تعلیم کے بارے میں سفارشات

-78 رپورٹ تعلیمی سفارشات (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۳ء) — جون ۱۹۸۲ء

معاشرتی اصلاحات

-79 رپورٹ معاشرتی اصلاحات — فروری ۱۹۹۳ء

-80 رپورٹ خاندانی منصوبہ بندی — مارچ ۱۹۸۴ء

-81 رپورٹ اسلامی معاشرے کی تشکیل — جون ۱۹۸۲ء

ذرائع ابلاغ کی اصلاح کے بارے میں سفارشات

-82 رپورٹ ذرائع ابلاغ عامہ — جون ۱۹۸۲ء

استفسارات (کے جوابات) پر رپورٹیں

83- رپورٹ استفسارات (۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۹ء) — مئی ۱۹۸۴ء

84- رپورٹ استفسارات(۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۱ء) — ستمبر ۱۹۹۱ء

متفرق مطبوعات

85- اسلام اور دہشت گردی — فروری ۲۰۰۶ء

86- حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء — فروری ۲۰۰۶ء

87- آزادئ نسواں، عہد رسالت میں(ترجمہ) چار جلدیں — جون ۲۰۰۷ء

88- رسالہ اجتہاد (سہ ماہی): پہلا شمارہ — جون ۲۰۰۷ء

89- رسالہ اجتہاد (سہ ماہی) دوسرا شمارہ — دسمبر ۲۰۰۷ء

90- حدود و تعزیرات، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ — ستمبر ۲۰۰۷ء

91- کونسل کی سالانہ رپورٹوں کا اشاریہ — ۲۰۰۷ء

92- "اسلام اور جدید معاشی مسائل" رپورٹ — فروری ۲۰۰۸ء

93- رسالہ اجتہاد، تیسرا وچوتھا شمارہ — ستمبر ۲۰۰۸ء

94- رسالہ اجتہاد، پانچواں شمارہ — جولائی ۲۰۰۹ء

95- قواعد وضوابط برائے تحقیق وتصنیف واشاعت — ۲۰۰۹ء

96- اصلاح قیدیان وجیل خانہ جات — ۲۰۰۹ء

97- فیوچر ایجنڈا فار چینج (انگریزی) — فروری ۲۰۰۹ء

98- رسالہ اجتہا، چھٹا شمارہ — جنوری ۲۰۱۰ء

99- رسالہ اجتہاد، ساتواں شمارہ — دسمبر ۲۰۱۱ء

100- رسالہ جتہاد، آٹھواں شمارہ — دسمبر ۲۰۱۲ء

101- رسالہ اجتہاد نواں ودسواں شمارہ — دسمبر ۲۰۱۴ء

102- اسلام اور انتہاء پسندی — دسمبر ۲۰۰۹ء

103- مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۱ء: سفارشات اور نظر ثانی — ۲۰۰۹ء

104- اشاریہ: سالانہ اور موضوعاتی رپورٹیں (۱۹۶۲ء۔۲۰۱۳ء) — ۲۰۱۶ء

105- اسلامی نظریاتی کونسل: ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی (حصہ اول) — جون ۲۰۱۶ء

106- اسلامی نظریاتی کونسل: ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی (حصہ دوم) — مئی ۲۰۱۷ء

اجتہاد

اسلامی نظریاتی کونسل